اشاعت نمبر ۴

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں علما کا مجاہدانہ کردار

مؤلف
عطاء الرحمٰن نوری
M.A., B.Ed., MH-SET, Journalist
(مبلغ سنی دعوت اسلامی)

ناشر: مکتبۂ طیبہ، مالیگاؤں
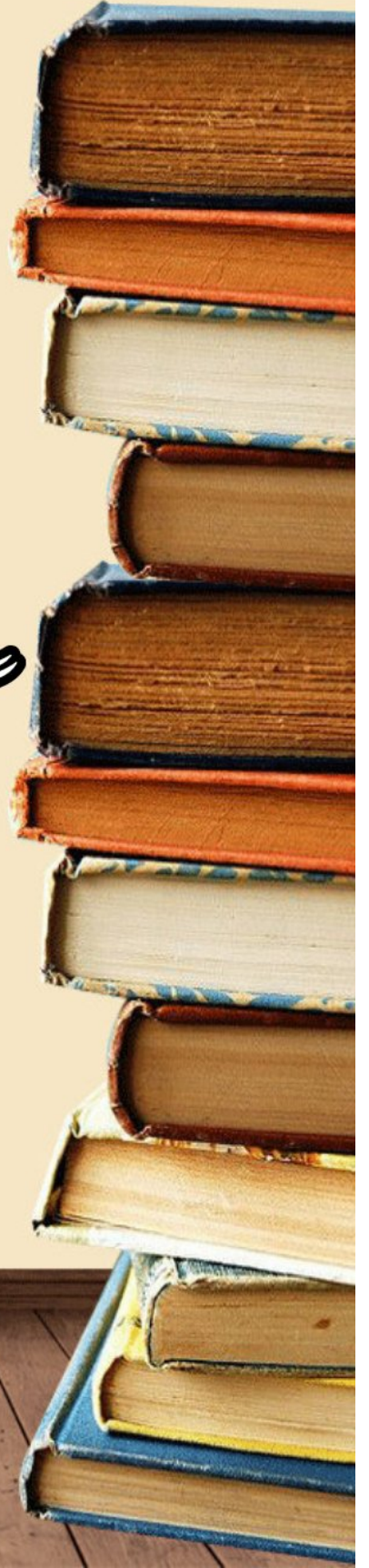
اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ
وَعَلٰی اٰلِکَ وَاَصْحَابِکَ یَا حَبِیْبَ اللّٰہِ
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء
میں علما کا مجاہدانہ کردار
مؤلف
عطاء الرحمن نوری
M.A., B.Ed., MH-SET, Journalist
(مبلغ سنی دعوت اسلامی)
رابطہ:
gmail.com@atanoori92
9270969026
عقیدت غوث و خواجہ، رضا و کل اولیاء
فخر جمال الدین خان قادری رضوی
ضلع تبراغ شریف نیپال
ناشر: مکتبہ طیبہ، مالیگاؤں

نام کتاب	:	جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں علما کا مجاہدانہ کردار
مؤلف	:	عطاء الرحمن نوری (مبلغ سنّی دعوت اسلامی)
کمپوزنگ	:	عطاء الرحمن نوری (مبلغ سنّی دعوت اسلامی)
ٹائٹل	:	عابد حسین عابد کمپیوٹر 8805576132
صفحات	:	٦٤
قیمت	:	
سن اشاعت	:	۱۱ ذوالقعدہ ۱۴۳۷ھ / ۱۵/ اگست ۲۰۱٦ء
تعداد اشاعت	:	ایک ہزار (۱۰۰۰)
اشاعت نمبر	:	چار
بموقع	:	٦۹ / ویں یوم آزادی
ناشر	:	مکتبۂ طیبہ، مالیگاؤں

فہرست

عنوان | صفحہ نمبر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی حَبِیْبِہِ الْکَرِیْمِ

شرف انتساب

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے مطالعات کو اپنی تحریروں سے روشن ومنور کرنے والے

آزادی ہند پر مستند اور تحقیقی کتابیں خوانِ مطالعہ پر سجانے والے

آزادیِ ہند کی یک طرفہ تاریخ سازی کرنے والوں سے باخبر کرنے والے

حق وباطل میں امتیاز پیدا کرنے والے

ہندوستان کی آزادی میں مجاہدین اہلسنّت کی خدمات اُجاگر کرنے والے

جن کی کتابیں ہمارے لیے رہنما اور رہبر ہیں

اور

جن کے اقتباسات آئندہ صفحات کی زینت ہیں

یعنی

محتاط فکر وقلم کے حامل، دانش ور، محقق اور مایۂ ناز ادیب

دارالقلم دہلی، کے بانی وصدر

رئیس التحریر علامہ

یٰسٓ اختر مصباحی صاحب کے نام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ امّا بعد!

کائنات میں حُسن و جمال ،نشیب وفراز ،سبزہ وزار، بہتے آبشار،گُلستاں کی بہار،دَست وکُہسار،بَل کھاتی ندیاں،سمندروں میں مدّوجزر کاخُمار،ستاروں کی انجمن، چاند کی چمک، سورج کی رَمَق ،بجلی کی دَمَک ،کلیوں کی مسکراہٹ ،بھَنوروں کے گُن گناہٹ، چڑیوں کی چہچہاہٹ،صبح کاسویرااوررات کااندھیراوغیرہ کوحُسنِ اتفاق کا نام نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ اکثر ایسانہیں ہوتا کہ پانی زمین پر پھینکنے سے کسی ملک یا عمارت کانقشہ بن جائے، جب تک اُس کے پیچھے کسی مُصوّر کی فن کاری کا ذوق کارفرمانہ ہو۔ بلاتشبیہ کائنات کی رعنائیاں بھی مصوّرِ حقیقی کی کرشمہ سازیوں کانتیجہ ہے۔جس کو جوملا، جتناملااور جس قدر ملا،اُسی رب الارباب بادشاہِ حقیقی کے دَر سے ملا۔اس لیے ہم جب بھی اپنے ملک ہندوستان پر نظر ڈالتے ہیں تو حب الوطنی کی چنگاری شعلۂ جَوّال بنتی ہوئی نظر آتی ہے اور سینے میں اپنے وطن ہندوستان کا جذبہ ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔خطۂ ہند پر اللہ پاک کی خصوصی نگاہِ کرم کااس سے بڑھ کر ثبوت اور کیاہوگا کہ پہلے نبی ، پہلاانسان، پہلی اذان، پہلی نماز، پہلی تسبیح، پہلی تکبیر، پہلی توبہ، پہلی دعا، پہلی ادا، پہلی صدا، پہلی نِدااور پہلے آنسواللہ عزوجل کی محبت میں اسی زمین کا مقدر رہے ہیں۔اسی خطے کی طرف کعبۃ اللہ کاسب سے افضل ترین رکن ''رُکن اَسود'' ہے،سب سے بڑھ کر یہ کہ حبیب رب العلیٰ مالک کون ومکاں دانائے سُبل مولائے کُل ختم الرّسل خسروے خوباں سیاح لامکاں وجہ کُن فکاں مصطفٰی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر کہ ''ہند سے عاشقوں کی خوشبو آتی ہے''ارضِ ہند کوارضِ محبت کا تمغہ عطا کر کے روم وفارس اور دیگر ممالک

کے لیے قابلِ رشک بنادیا ہے۔

اللہ رب العزت کی خصوصی عنایتوں اور رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے الطاف وکرم کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہر دور میں ہمارا پیارا وطن ہندوستان سب کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ ہمارے آقا رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے بھی ہند سے دوسری قوموں کے علاوہ اہل عرب کے تعلقات اور آمد ورفت کے ٹھوس شواہد ملتے ہیں۔اہل عرب اور اہل فارس کی شاعری میں جابجا ہندوستان کا ذکر ملتا ہے۔صحیح معنوں میں اگر شرافت کی نگاہ سے اور تعصب کی عینک ہٹا کر دیکھا جائے تو ہندوستان کا سب سے قدیم مذہب ''اسلام'' ہے۔کیوں کہ حضرت آدم علیہ السلام مذہب اسلام کے سب سے پہلے پیغمبر، دنیا کے پہلے انسان اور تمام انسانوں کے باپ ہے۔اس اعتبار سے ہندوستانیوں کا آبائی مذہب ''اسلام'' ہے۔اسلام کا آغاز ہندوستان ہے اور تکمیل عرب۔اس لیے پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسانیت کی تاریخ۔ چنانچہ خاتم النبین جانِ آدم فخرِ بنی آدم جناب محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نظامِ رحمت ہندوستان میں کب آیا اس سلسلے میں تاریخ کے معتبر حوالے یہی پتہ دیتے ہیں کہ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آواز عرب کے صحراؤں میں گونج رہی تھی اُس وقت دیوانگانِ رسول گنگا جمنا کے کنارے وضو کررہے تھے اور مالابار کے ساحلوں پر جبینیں سجدوں کے لیے بے قرار تھی۔

شاعرمشرق ڈاکٹراقبال فرماتے ہیں ؎

اے آب رودِ گنگا کیا دن ہے یاد تجھ کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

بانگ درا''ہمالہ''میں مزید لکھتے ہیں ؎

اے ہمالہ!داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا

داغ جس پہ غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح وشام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب عرب کے بوریاں نشینوں کو قرآن سنا کر معرفت خداوندی عطا کر رہے تھے اُس وقت قرآن کی انقلاب آفرین صدائیں گجرات کے ساحلی علاقوں کو اپنے آغوشِ کرم کی طرف متوجہ کر چکی تھی۔گویا کہ آقائے کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیات میں اسلام کا پیغام ہند پہنچ چکا تھا۔محمد بن قاسم ثقفی، سلطان محمود غزنوی، سلطان شہاب الدین محمد غوری اور ان جیسے متعدد جیالے نوجوانوں کے علاوہ بہمنی سلطنت، قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، برید شاہی، عماد شاہی، مغلیہ اور آصفیہ سلطنتوں کے بانیان، بادشاہوں اور حکمرانوں نے اس ملک کے نظام جہاں بانی میں انقلاب پیدا کیا۔نیز بادشاہوں کے ساتھ صوفیائے کرام نے بھی اپنے اخلاق وکردار سے اہل ہند کے دل جیت لیے۔یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ بادشاہ زمینوں کو فتح کررہے تھے اور صوفیائے کرام دلوں کو۔گویا خطۂ ہند کا نصیبہ عروج پر تھا، ایک طرف زمین کے فاتح اور دوسری طرف ضمیر کے۔اُسی حسین دور کی رہین منت نے ملک ہندوستان کو سونے کی چڑیا بنادیا کیوں کہ مسلم بادشاہوں نے یا صوفیائے کرام نے ہندوستان کو دیارِ غیر سمجھ کر لوٹ مار اور قتل وغارت گری کرنے کی بجائے اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی زمین اور اپنا آبائی وطن سمجھ کر خوب سجایا اور سنوارا جس کی روشن دلیلیں تاج محل آگرہ، لال قلعہ دہلی اور آگرہ، جامع مسجد دہلی اور فتح پور سیکری، پنچ محل فتح پور سیکری، قطب مینار دہلی، بلند دروازہ گجرات، شالیمار باغ کشمیر، ہمایوں کا مقبرہ دہلی، شیر شاہ سوری کا مقبرہ بہار، اعتمادالدولہ کا مقبرہ آگرہ، بی بی کا مقبرہ اورنگ آباد، گول گنبد بیجاپور، قابلی مسجد پانی پت، چار مینار حیدرآباد، تاج المسجد بھوپال، اشرفی محل مدھیہ پردیش، اور ان جیسی بہت سی خوبصورت عمارتوں کی شکل میں موجود ہیں۔خطیب الہند علامہ عبیداللہ خان اعظمی صاحب نے اس کی منظر کشی یوں کی ؎

ہند کو ناز ہے جس پر وہ نشانی ہم ہیں
تاج اور لال قلعہ کے یہاں بانی ہم ہیں

محبتوں کی سرزمین ہندوستان پر مسلم حکمرانوں نے صدیوں تک حکومت کیں، اسی اثنا میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ تن کے گورے من کے کالے انگریزوں نے تجارتی کمپنیوں کے بہانے ہندوستان پر قابض ہونا چاہا، اس وقت مسلم حکمرانوں میں نہ کوئی محمود غزنوی تھا اور نہ ہی کوئی اورنگ زیب عالمگیر جیسا بہادر بادشاہ۔ نتیجتاً دھیرے دھیرے پورے ملک پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ اقتدار مسلمانوں سے چھینا گیا تھا اس لیے فطرتاً جو درد اور کرب مسلمانوں کو تھا دوسروں کو نہ ہوا۔ کیوں کہ انگریز مذہب کے بھی دشمن تھے اور جان کے بھی۔ اس لیے انگریزوں کے خلاف مسلم قائدین نے صدائے انقلاب بلند کیا۔ اس ضمن میں مجاہدین اور بالخصوص علمائے کرام کی قربانیاں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ مگر بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جن کا ملک کی آزادی میں دور کا بھی واسطہ نہیں وہ آج چند ایمان فروشوں کے سبب آزادی کے ہیرو بنا دیئے گئے ہیں اور جن کی جائیدادیں ضبط کی گئیں، جن کا گھربار نیلام کیا گیا، جن کی لائبریریاں پھونک دی گئیں، جنھیں ملک بدر کیا گیا، جن کی زندگیوں کو کانٹوں سے زیادہ پُرخار بنا دیا گیا، جنھیں جیل بھیجا گیا، جنھیں پھانسیاں دی گئیں، جنہیں خنزیر کی کھالوں میں سِل دیا گیا، جن کی آنکھوں کے سامنے اُن کے گھر والوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا اور جنہوں نے تن من دھن کی قربانیاں دیں، ان سرفروشوں کو فراموش کر کے تاریخ ہند کی گردن کو اُلٹی چھری سے ذبح کیا جا رہا ہے۔ جب بھی آزادیِ ہند کی بات کی جاتی ہے تو بڑی صفائی سے جھوٹ، فریب اور مکر سے انگریزوں کے ایجنٹ اور ملک وملت کے غداروں کو مجاہدِ حریت بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ایسا سفید جھوٹ بولنے والے تاریخ دشمن لوگوں کو حیرت بھی حیرت سے تکتی ہوگی۔ مگر یاد رہے جہاں کذب ہے وہی صداقت بھی، جہاں دجل وفریب ہے وہی پیکرانِ خلوص ووَفا بھی، جہاں جھوٹ کو سچ بنانے والے ہیں وہی جھوٹ کا پردہ فاش کرنے والے بھی۔ بھَلا ہواُن

علمائے کرام اور قلم کاروں کا جنھوں نے تاریخ پر ظلم کرنے والوں کا پنجہ مروڑنے کے لیے کمر کَس لی ہیں۔ اللہ انھیں سلامت رکھیں جو تاریخی سچائیوں کو نسلِ نو تک پہنچانے کے لیے اَنتھک کوششیں کررہے ہیں۔ اُنہیں میں موجودہ دور میں سرِ فہرست "اسلاف شناسی کی تحریک" پیش کرنے والے عظیم مفکر، رئیس التحریر حضرت علامہ یاسین اختر مصباحی صاحب قبلہ مدظلہ العالی جن کا کارنامہ لائق تحسین بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔ علامہ یاسین اختر مصباحی کی کوششوں نے نوجوان قلم کاروں کو متاثر کیا اور اس سمت میں اہلسنّت کی طرف سے کام کا آغاز ہوا۔ نئی نسل جن بزرگوں کے نام تک نہیں جانتی تھی اب ان کے ناموں اور کارناموں کو پڑھ اور سُن کر اپنی معلومات میں اضافہ کررہی ہے۔

اسی کی ایک کڑی میرے مخلص ساتھی تحقیقی ذہن رکھنے والے سند یافتہ صحافی جناب عطاء الرحمن نوری (مبلغ سنّی دعوت اسلامی، مالیگاؤں) نے علمائے اہلسنّت بالخصوص علامہ یاسین اختر مصباحی صاحب کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے ملک ہندوستان کی آزادی میں قربانی دینے والے اور تحریک آزادی کے اصل بانیین وقائدین کا تذکرہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ گذشتہ دو تین سالوں سے یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کے موقع پر ماہنامہ سنّی دعوت اسلامی ممبئی، ماہنامہ کنزالایمان دہلی، سالنامہ روشنی دہلی، ممبئی کے اخبارات انقلاب، اردو ٹائمز، صحافت، ہندوستان اورنگ آباد، ماہانہ پیغام رضا اُجین، مالیگاؤں کے اخبارات شامنامہ، دیوان عام، ترجمان، نشاط نیوز، بہار سنّت، ڈسپلن اور ہماری ویب ڈاٹ کام پر عطاء الرحمن نوری کے آن لائن مضامین آرہے تھے۔ سال گذشتہ "دیوان عام" میں مسلسل گیارہ دنوں تک گیارہ قسطیں شائع ہوئیں۔ مذکورہ تمام مضامین کو فقیر قادری کی فرمائش پر برادر گرامی نے کتابی صورت میں مرتب کیا ہے جس میں انھوں نے تاریخی قرائن وحقائق کے ساتھ یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کی آزادی علمائے اہلسنّت کے دم قدم سے متصور ہے اور ملک کی آزادی کے معاملے میں مسلمانوں کو بالخصوص علمائے اہلسنّت کو نظر انداز کرنا بہت بڑی زیادتی ونا انصافی ہے۔

تعصب اور مسلکی تضاد کی بنیاد پر سارا کریڈٹ دوسروں کو دینا روایت ودرایت کے خلاف ،تاریخ سے چھیڑ خانی کرنے کے مترادف اور سچائی کا گلا گھوٹنا ہے۔ اللہ تعالیٰ برادرِ گرامی جناب عطاء الرحمن نوری کو بہتر جزا عطا فرمائے اور ان کی کوششوں کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔مصروفیت کے سبب میں کتاب کو مکمل نہیں دیکھ سکا،البتہ کتاب اور اس کے مضامین کو مختصراً دیکھا،چوں کہ کتاب پریس پر جانے والی ہے اور عطاء الرحمن بھائی کا اصرار ہے کہ میں جلد اپنا مضمون روانہ کروں ،وقت کی تنگی اور سفر کی مصروفیات کے سبب عجلت میں چند سطریں قارئین کی نذر اس اُمید پر کیا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ میرے ٹوٹے پھوٹے بے جوڑ جملوں کو قبول فرمائے اور آخرت میں ذریعۂ نجات بنائے اور اللہ ہم سب سے وہ کام لے جس سے اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ راضی ہوجائے۔آمین بجاہ الحبیب الامین وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین برحمتک یاارحم الراحمین

کام وہ لے لیجیے تم کو جو راضی کرے
ٹھیک ہو نام رضا تم پہ کروڑوں درود

فقط

سگ بارگاہ پنج تن وغوث اعظم

(مولانا)سید محمد امین القادری الرضوی الرفاعی

(نگراں سنّی دعوت اسلامی،مالیگاؤں)

۲۷رشوال المکرم ۱۴۳۷ھ بمطابق ۲راگست ۲۰۱۶ء

ہندوستان کی اصطلاح

لفظ ''ہند'' یا ''ہندوستان'' عرب کے لوگ فارس اور عرب کے مشرقی علاقے میں آباد قوموں کے لیے استعمال کیا کرتے تھے اور اسی سے ہندوستان کی اصطلاح برصغیر کے بیشتر علاقوں کے لیے استعمال ہونا شروع ہوگئی۔ مختلف سلطنتوں اور بادشاہتوں کے تحت بادشاہتِ ہند کی سرحدیں بدلتی رہیں۔ آخر برصغیر ہندوپاک کا سارا علاقہ برطانوی تسلط میں آ کر ''برطانوی انڈیا'' یا ''ہندوستان'' کہلانے لگا۔ یہ صورتِ حال ۱۹۴۷ء تک برقرار رہی۔ اس میں موجودہ بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان شامل تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہاں دو ملک بن گئے جنہیں بھارت اور پاکستان کہا گیا۔ بعد ازاں پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصے علیحدہ ہو گئے۔ مشرقی حصہ بنگلہ دیش کہلایا۔ موجودہ زمانے میں ہندوستان سے واضح طور پر جغرافیائی خطہ ہندوستان ہی مراد لیا جاتا ہے۔

''ہند'' یا ''ھند'' کا لفظ پہلی صدی قبل مسیح میں استعمال ہوا۔ پہلی صدی عیسوی میں جب عرب ہندوستان تجارت کے لیے آئے تو انہوں نے دریائے سندھ سے مشرقی طرف تمام علاقہ جات کو ''ہند'' کہا پھر اس لفظ کا اصل استعمال فارسی زبان سے ہوا۔ فارسی میں یہ لفظ ''ہند'' سے ''ہندوستان'' میں تبدیل ہو گیا۔ یہ لفظ قدیم فارسی لفظ ''ہندوس'' سے لیا گیا جو خود سنسکرت کے لفظ ''سندوس'' سے نکلا ہے جس کا مطلب وہ علاقے جو دریائے سندھ کے پیچھے آتے ہوں۔ تاہم اس طرح یہ لفظ جدید فارسی میں ''ہندو'' اور اسکے ساتھ ''ستان'' (جگہ) کے مجموعے سے جنم پا گیا۔ پرانے زمانے میں چینی زبان میں ''ہنت-تو'' کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ اس لفظ کو بالکل سرکاری وجود مغل سلطنت کے دور میں ملا یعنی مغل شہنشاہوں نے اپنی سلطنت کو ہندوستان کا نام دیا۔ (وِکی پیڈیا)

بھارت دنیا میں ساتواں سب سے بڑا ملک ہے۔اس کا موجودہ کل رقبہ 3287.263 مربع کلومیٹر ہے۔شمال تا جنوب 3214 رکلومیٹر اور مشرق تا مغرب 2933 رکلومیٹر ہے۔

سرزمین ہند سے ہمارا رشتہ

ہندوستان وہ ملک ہے جو ہمیشہ سے مسلمانوں کا مسکن رہا ہے۔صحابۂ کرام ،تابعین عظام اور تبع تابعین کے قافلے اسلام کے فروغ واستحکام کے لیے ہند کی سرزمین پر تشریف لاتے رہے ہیں۔اسلام کے سب سے پہلے پیغمبر اور دنیا کے سب سے پہلے انسان اسی سرزمین پر جنت سے تشریف لائے۔ساتھ ہی کائنات کی جان ،وجہِ تخلیق کائنات ،کارخانہ قدرت کے عظیم شاہکار مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کا نور بھی پیشانیٔ آدم کے ساتھ سب سے پہلے ہندوستان آیا۔ یہاں مراد وہ ہندوستان ہے جس میں پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور ایک چھوٹا سا حصہ چین (جس حصے کو اکسائی چین کہا جاتا ہے) اور اس کے ساتھ برما کا ایک چھوٹا سا حصہ ہندوستان میں شمار کیا جاتا ہے۔

علامہ عبدالرزاق بھترالوی تحریر فرماتے ہیں کہ ''حضرت آدم علیہ السلام سراندیپ (سری لنکا) میں اور حضرت حوا ''جدّہ'' میں اتارے گئے۔'' (تذکرۃ الانبیاء،ص ر ۶۰)

حسان الہند مولانا سید غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰ رھ) رقم طراز ہیں: ''حضرت آدم علیہ السلام کی برکت سے ہندوستان میں جواہرات اور کانوں کا وجود ہے۔کسی نے ہندوستان کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''اس کے سمندر موتی ہیں،اس کے پہاڑ یاقوت ہیں،اس کے درخت عود اور پتے عطر ہیں۔'' (شمامۃ العنبر ،مترجم: سید علیم اشرف جائسی، طبع جائس، ص ر ۶۴)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''ہندوستان کی زمین اس لیے عمدہ اور ہری بھری ہے اور عود قرنفل وغیرہ خوشبوئیں اس لیے وہاں پر پیدا ہوتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام جب اس زمین پر آئے تو ان کے جسم پر جنّتی درخت کے پتے تھے۔وہ پتے ہوا سے اُڑ کر جس درخت

پر پہنچے وہ ہمیشہ کے لیے خوشبودار ہو گیا۔‘‘ (تفسیر نعیمی، جلد ۱، ص ر ۲۸۴)

مولانا سید غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے اشعار میں بھی ہندوستان کا ذکر کیا ہے۔ جس میں مذکورہ نکتہ کی وضاحت ہوتی ہے ؎

قد اُودع الخلاق آدم نورہ　　متلالأ کالکوکب الوقاد
والہند مہبط جدنا و مقامہ　　قول صحیح جید الأسناد
فسواد أرض الہند ضاء بدایۃ　　من نور احمد خیرۃ الأمجاد

ترجمہ: بنانے والے نے آدم علیہ السلام کے اندر اپنا نور رکھ دیا، روشن ستارے کی طرح چمکتا ہوا۔ ہندوستان ہمارے جد امجد کی جائے نزول اور قیام گاہ ہے۔ یہ صحیح قول ہے اور اس کی سند مضبوط ہے تو ہندوستان کی سرزمین سب سے پہلے نورِ محمدی ﷺ سے ضیاء بار ہوئی، جو سب عظمت والوں سے بہتر ہیں‘‘۔ (شمامۃ العنبر، مترجم: سید علیم اشرف جائسی، طبع جائس، ص ر ۸۹)

ڈاکٹر اقبال نے اسی نکتہ کی وضاحت کچھ اس طرح کی ؎

ہے اگر قومیت اسلام پابند قوم
ہند ہی بنیاد ہے اس کی، نہ فارس ہے نہ شام

معلوم ہوا کہ ہندوستان سے ہمارا رشتہ عہد صحابہ، مجاہد اسلام محمد بن قاسم اور مغلیہ حکومت سے نہیں ہے بلکہ یہ تو ہمارے باپ کی سرزمین ہے۔ اسلام کی بنیاد اور اساس کا رشتہ ہندوستان کی سرزمین سے اتنا مضبوط ہے کہ ہمیں اپنی حب الوطنی ثابت کرنے کے لیے شیو، وشنو، شنکر اور پاروَتی کو اسلامی پیغمبر کا درجہ دینے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو ہندوستانی ثابت کرنے کے لیے اسلامی تعلیمات و تاریخ کی دھجیاں اڑانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ہم وطنوں کو راضی کرنے کے لیے اللہ و رسول ﷺ کو ناراض کرنے کی بھی حاجت نہیں۔ شنکر، شیو، وشنو، پاروَتی اور دوسرے ہندو دیوی و دیوتاؤں کو پیغمبر بنا کر، اپنے ماں باپ تسلیم کر کے، اپنے آپ کو ہندوستانی ثابت کر کے کیا فائدہ؟ ہمارے ہندوستانی ہونے کی سب سے مضبوط دلیل یہ ہے کہ ہمارے جد امجد اور دنیا کے سب سے پہلے انسان اسی سرزمین پر جنت سے تشریف لائے۔ آیئے اسلامی تاریخ کی روشنی میں اسلام اور ہندوستان کا تعلق کس قدر مضبوط ہے جاننے کی کوشش کریں۔

ہند کے فضائل ومناقب

مضمون ''بابارتن ہندی بحیثیتِ صحابیِ رسول'' کی آخری قسط میں مولانا محمد رفیق احمد مصباحی صاحب فضائل ہند کا تذکرہ کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

☆ دنیا کے پہلے انسان ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سب سے پہلے اسی دھرتی پر تشریف لائے۔آپ کو ہندوستان میں ''سراندیپ'' کے ''لوذ۔یا۔راہون'' پہاڑ پر اتارا گیا۔

☆ بلکہ پشت آدم کے حوالے سے ایک لاکھ کم وبیش چوبیس ہزار انبیا ومرسلین یہیں ہند میں اُتارے گئے۔

☆ سیدنا آدم علیہ السلام نے اسی سرزمین پہ اشک ندامت بہائے، تین سو سال تک روتے رہے اور آسمان کی طرف آپ نے حیا کی خاطر سَر نہیں اٹھایا۔

☆ آپ نے دعائیں اسی جگہ مانگیں۔

☆ آپ کی توبہ یہیں قبول ہوئی۔

☆ پیارے مصطفی ﷺ کا وسیلہ رب کی بارگاہ میں آپ نے اسی دھرتی پر پیش کیا۔

☆ نبی آخرالزماں سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے نام پاک کا نعرہ وغلغلہ زمین پہ سب سے پہلے یہیں بلند ہوا۔

☆ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت شیث علیہ السلام کا مزار پاک بھی ہندوستان میں ہے۔(ایودھیا میں بتایا جاتا ہے۔)

☆ توالد وتناسل کا سلسلہ بھی یہیں سے شروع ہوا۔گویا ہندوستان تمام مسلمانوں اور انسانوں کا آبائی وطن ہے۔

☆ سید الملائکہ جناب جبرئیل علیہ السلام ایک نبی کی بارگاہ میں سب سے پہلے سرزمین ہند پہ آئے۔

☆ سب سے پہلے اذان ہندوستان میں ہوئی۔
☆ سب سے پہلی نماز بھی یہیں ہوئی، جو آپ نے قبول توبہ کے شکرانے میں ادا فرمائی۔
☆ آپ نے چالیس حج اور ایک ہزار عمرے بھی اسی سرزمین ہند سے مکہ شریف پیدل جا کر ادا فرمائے، کعبہ چوں کہ آپ کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے فرشتوں کے ذریعے تعمیر ہو چکا تھا۔
☆ جنتی اوزار: سانڈسی، ایرن اور ہتھوڑا ہندوستان میں اُتارے گئے۔
☆ جنتی برگ وثمر اور خوشبوئیں یہیں اتاری گئیں۔
☆ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ انجیر کے پتے، عجوہ کھجور، کیلا اور لیموں وغیرہ یہیں اُتارے گئے۔
☆ فصل، گل وشبنم، پیڑ پودے اور کھیتیاں سب سے پہلے اسی دھرتی پہ لہلہائیں۔
☆ حضور ﷺ لوگوں کو ہندوستانی جڑی بوٹی ''عود ہندی'' کے استعمال پر زور دیتے تھے کہ اس میں سات بیماریوں سے شفا ہے۔
☆ آج بھی دواؤں میں استعمال ہونے والی بیشتر جڑی بوٹیاں اور خوشبوئیں ہندوستان میں پیدا ہوتی ہیں۔

فضائل ہند کی روایتیں مندرجہ ذیل کتب سے ماخوذ ہیں: بخاری شریف کتاب الطب ج ۲ ص ر ۸۴۹ تا ۸۵۱، سنن ابی داؤد، کتاب الطب ج ۲ ص ر ۵۴۱، تفسیر الدر المنثور سورۂ بقرہ، ج ۱، ص ر ۱۱۰، ۱۱۵، تفسیر مدارک شریف ج ۳ ص ر ۶۸، تفسیر روح البیان ج ۱ ص ر ۲۳ے۔۴۹۸، تفسیر نعیمی ج ۱ ص ر ۲۹۰ تا ۲۹۱، تفسیر خازن وتفسیر جمل، حاشیۂ صاوی ج ۱ ص ر ۶۴، ۱۱۰، حاشیہ شیخ زادہ ج ۱، ص ر ۲۶۶، ۲۶۷، ۴۲۰، حاشیۂ جلالین ص ر ۱۳۱، حاشیہ نمبر ۲، مدارج النبوۃ ج ۱ ص ر ۵ (ماہنامہ کنز الایمان، مارچ ۲۰۱۰ء، از: محمد رفیق احمد مصباحی، ص ۳۵)

غزوۂ ہند کا ذوق

ہندوستان پر کئی مجاہدین نے فوج کشی کی مگر غزوۂ ہند کا یہ ذوق محض کشور کشائی کے جذبے سے نہیں تھا بلکہ انہوں نے جہادِ ہند کے لیے پیش رفت ارشادِ نبوی کی تکمیل کے لیے کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے دو گروہوں کو اللہ تعالیٰ نے جہنم کی آگ سے محفوظ رکھا ہے۔ ایک وہ گروہ جو ہندوستان میں جہاد کرے گا اور دوسرا وہ گروہ جو حضرت ابن مریم کا ساتھ دے گا۔ (سلطان الہند خواجہ غریب نواز علیہ الرحمہ، ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، ص ۱۳)

ابن ابوحاتم حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: "خیر وادیین فی الناس وادی مکۃ ووادی ارم بالھند۔" یعنی مکہ مکرمہ اور ہندوستان سارے جہاں سے اچھا ہے۔ (تفسیر الدر المنثور، ج ۶، ص ر ۱۳، مطبع بیروت) یقیناً باستثنائے دیارِ حرم اور روضۂ رسول کے (کیوں کہ روضۂ رسول کا وہ حصہ جہاں سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جسم اطہر ہے وہ عرش اعظم سے بھی بہتر ہے) ہمارا ہندوستان سارے جہاں سے اچھا ہے، جہاں سے ہمارے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بوئے وفا محسوس کی، ہندوستان کی طرف دیکھ کر ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسکرائے ہیں، خود سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ہندوستان کی سرزمین پر جہاد کرنے والے مجاہدین کو جنت کا مژدۂ جاں فزا سنایا، ان پر جہنم کی آنچ حرام قرار دی، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمیشہ ہندوستان آنے کے مشتاق رہتے تھے، ان کی تمنا تھی کہ کاش میں ہندوستان کے کسی غزوے میں شریک ہوتا، تو اپنی جان اور اپنا مال خرچ کرتا۔ (سنن نسائی، کتاب الجہاد، باب غزوۃ الہند، ج ۲ ص ر ۵۲)

شاید انہی تمام خوبیوں کو دیکھتے ہوئے اور ان کی منظر کشی کرتے ہوئے شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال نے کہا تھا کہ ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہندوستان میں اسلام

ہندوستان کی سرزمین جہاں ان تمام تر فضائل ومناقب اور خصوصیات کی حامل ہے وہیں اس دھرتی کو خداوند قدوس نے صحابیت کے شرف سے بھی مشرف فرمایا۔ ان فضائل کے علاوہ بھی ہند کی دھرتی متعدد فضائل کی حامل ہے۔ تفصیل کے لیے کتب احادیث وتاریخ کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ یہاں مقصود آزادیٔ ہند کا مختصراً تذکرہ ہے اس لیے سرسری طور پر تاریخ ہند پیش کی جارہی ہے۔ صوفیائے عظام، مشائخ کرام، دعاۃ، مبلغین اور اجلہ علمائے کرام کے دم قدم اور فیضان وبرکت سے ہر دور میں ہندوستان میں اسلام کی شمع روشن رہی اور ایمان کی باد بہاری سے ہر خطہ لہلہاتا رہا۔ عہد بہ عہد شمع اسلام کی لَو اور اس کی روشنی تیز تر ہوتی گئی اور چراغ سے چراغ جلتے چلے گئے۔

مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی (وصال صفر ۱۰۳۴ھ/ دسمبر ۱۶۲۴ء)، امام المحدثین شاہ عبدالحق محدث دہلوی (وصال ربیع الاول ۱۰۵۲ھ/ جون ۱۶۴۲ء)، امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (وصال ۱۱۷۶ھ/ دسمبر ۱۷۶۲ء)، سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۳ء)، بحر العلوم علامہ عبدالعلی فرنگی محلی لکھنوی (وصال صفر ۱۲۲۵ھ/ دسمبر ۱۸۱۰ء)، شمس العارفین حضرت سید شاہ آل احمد اچھے میاں قادری برکاتی مارہروی (وصال صفر ۱۲۳۵ھ/ دسمبر ۱۸۲۰ء)، امام الحکمت والکلام علامہ فضل حق خیرآبادی (وصال صفر ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء)، مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی (وصال صفر ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) اور دوسرے بہت سے جید وممتاز علمائے کرام نے اپنی مساعی جمیلہ سے کفر وارتداد کے اٹھنے والے ہر فتنے کا سر قلم کیا اور اسلامی تعلیمات وقوانین کی محافظت کا فریضہ انجام دیا۔ ۱۸۵۷ء کے سنگین ودردناک حالات میں علمائے اہلسنّت نے مسلمانان ہند کی جو فکری قیادت کی اس سے مؤرخین بخوبی واقف ہیں۔ یہ ایک مسلم الثبوت اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہندوستان کی آزادی علمائے کرام ہی کے دم قدم سے متصور ہے۔ آج ہم آزادی کی جس خوشگوار فضا میں زندگی کے لمحات بسر کررہے ہیں، یہ علمائے حق ہی کے سرفروشانہ جذبات

اور مجاہدانہ کردار کا ثمرہ ہے۔انھیں کے مقدس لہو سے شجر آزادی کی آبیاری وآبپاشی ہوئی ہے۔ اگر انہوں نے بروقت حالات کے طوفانی رُخ کا تدارک نہ کیا ہوتا تو آج مسلمان یہاں کس حال میں ہوتے وہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

مغلیہ عہد حکومت

مغلیہ عہد حکومت پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ مغلیہ سلطنت میں بگاڑ اس وقت پیدا ہوا جب بادشاہِ ہند جلال الدین محمد اکبر (م ١٦٠٦، آگرہ) نے دین الٰہی کی بنیاد رکھ کر امت میں انتشار وافتراق پھیلایا۔ اکبر ہی کے دورِ حکومت میں ملکہ الزبتھ کے ذریعے لندن کی ایک تجارتی کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کرنے کی منظوری ملی۔ ١٦٠٨ء سے لے کر ١٦٦٦ء تک مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر اور شاہجہاں کے دور حکومت میں سورت (گجرات)، کھمبات، گوا، احمد آباد اور کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو آزاد تجارت کے وسیع مواقع میسر ہوئے ۔حضرت اورنگ زیب عالمگیر (۱۷۰۷ء) کے وجود کے ساتھ ہی مسلمانوں کی غیرت وحمیت اور مغل حکمرانوں کا رعب ودبدبہ بھی سپرد خاک ہوگیا۔ محمد معظم معروف بہ شاہ عالم بہادر شاہ فرزندِ اورنگ زیب کے عہد حکومت از ۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء، جہاں دار شاہ فرزندِ شاہ عالم بہادر شاہ کے عہد حکومت از ۱۷۱۲ء تا ۱۷۱۳ء، جہاں دار شاہ کے برادر زادہ فرخ سیر کے عہد ۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء، شاہ عالم بہادر شاہ کے پوتے محمد شاہ رنگیلے کی مدت حکومت ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء تک مغلیہ حکومت کی کمزوری وابتری، ذلت ورسوائی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے برتری کا دور تھا۔ حتیٰ کہ ابوالمظفر جلال الدین سلطان عالی گوہر معروف بہ شاہ عالم ثانی مدت حکومت ۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء حکومت اتنی کمزور وناتواں ہوگئی کہ بادشاہ ہونے کے باوجود شاہ عالم ثانی وظیفہ خوری کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ جابجا بغاوتیں اور شورشیں برپا ہوئیں اور ہندوستان کے ہر حصے میں خودمختار ریاستیں قائم ہوگئیں۔ رہی سہی کسر نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی کے یکے بعد دیگرے کئی حملوں نے پوری کردی۔ تخت وتاج کی بوالہوسی، حصولِ زروزن اور عیش پرستی کے اس دور میں انگریز اپنا تجارتی لبادہ اتار کر حاکم بننے کے لیے کمربستہ ہوگئے۔

شیر میسور سلطان ٹیپو

۱۷۵۷ء میں رئیس بنگال نواب سراج الدولہ کی قیادت میں جنگ پلاسی، ۱۷۶۴ء میں جنگ بکسر، ۱۷۷۴ء میں جنگ روہیل کھنڈ اور اس کے بعد حیدر علی سے انگریزوں نے کئی جنگیں لڑیں اور اپنوں کی فریب کاری، مکاری، دغابازی اور عیاری کے سبب انگریز ہر محاذ پر کامیاب ہوئے۔ ۱۷۸۲ء میں حیدر علی کا انتقال ہو گیا اور ان کی قائم مقامی ان کے جاں باز بیٹے سلطان ٹیپو نے کی۔ سلطان ٹیپو محب اسلام اور محب وطن تھا۔ موت کی آخری ہچکی تک ٹیپو انگریزوں کے خلاف نبرد آزمارہا۔ سلطان ٹیپو نے ملک کی حفاظت کی خاطر افغانستان، ایران اور خلافت عثمانیہ (ترکی حکومت) سے مغربی سامراج کے خلاف فوجی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ۱۷۸۴ء میں سب سے پہلے عثمان علی خان کو اس مہم پر قسطنطنیہ روانہ کیا مگر افسوس یہ سفارت ناکام ثابت ہوئی۔ سلطان ٹیپو اپنی اس سفارتی ناکامی سے مایوس نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد بھی دو دفعہ خلیفۂ روم کی خدمت میں اپنا سفارتی وفد روانہ کیا، آخری وفد ۱۷۹۷ء کو روانہ کیا گیا تھا مگر یہاں بھی مایوسی ہاتھ آئی۔ شیر دل حکمراں نے ایران کے حاکم کریم خان زند اور افغانستان کے حکمراں زمان شاہ درانی کے پاس بھی وفود روانہ کیے، دونوں مدد کے لیے تیار بھی ہو گئے بلکہ زمان شاہ بھی ٹیپو کی فوجی مدد کے لیے ہندوستان کی سرحد پر پہنچ گیا تھا لیکن ایران کے افغانستان پر اچانک حملہ کی وجہ سے اس کو راستہ ہی سے واپس جانا پڑا۔ اس کے بعد سلطان ٹیپو نے نظام حیدر آباد اور مرہٹوں سے بھی مفاہمت کی کوشش کی۔ سلطان نے بڑی حکومتوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی خود مختار سلطنتوں یعنی کشمیر، جودھپور، جے پور اور نیپال وغیرہ کے ہندو راجاؤں کے پاس بھی سفیر دعوتِ اتحاد دے کر روانہ کیے اور انہیں انگریزوں کی چال اور ہندوستان کے سلسلے میں ان کے ناپاک عزائم سے آگاہ کیا۔ غرضیکہ ٹیپو نے ایک محب اسلام ہونے کے ناطے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف جنگ سے باز رکھنے کی حتیٰ الامکان کوشش کی اور دوسری طرف بحیثیت ایک محب وطن مرہٹوں سے بھی مصلحت کی کوشش کی لیکن افسوس کہ انگریز اپنی عیاری

سے ان دونوں کو ٹیپو سے دور رکھنے اور ٹیپو کے خلاف اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے۔ اپنے ہی قول ''شیر کے ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے بہتر ہے'' پر عمل کرتے ہوئے حریت کا یہ آفتاب ۴ رمئی ۱۷۹۹ء کو سرنگا پٹنم کی سرزمین پر ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا ؎

اے شہیدِ مردِ میدانِ وفا تجھ پر سلام
تجھ پے لاکھوں رحمتیں لا انتہا، تجھ پر سلام
ہند کی قسمت ہی میں رسوائی کا سامان تھا
ورنہ تو ہی عہدِ آزادی کا ایک عنوان تھا
اپنے ہاتھوں خود تجھے اہلِ وطن نے کھودیا
آہ کیسا باغ باں شامِ چمن نے کھودیا

ہندوستان کے شیر دل حکمراں سلطان ٹیپو کو شہید کرنے کے بعد انگریز کمانڈر نے کہا تھا کہ ''آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔'' یعنی آج صرف سلطان ٹیپو نے شکست نہیں کھائی ہے بلکہ ہندوستان نے شکست کھائی ہے۔

فورٹ ولیم کالج اور سلطان ٹیپو کی تاریخ شہادت

انگریزوں نے اپنے ملازمین کی تعلیم و تربیت کے لیے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام کیا۔ ساوتری بائی پھولے یونا یونی ورسٹی کے ایم اے اردو کے نصاب میں شامل میر امّن دہلوی کی کتاب ''باغ و بہار'' کے مقدمہ میں سلیم اختر لکھتے ہیں کہ

''کالج کے اصل قیام کی تاریخ سے ہٹ کر اس پر سقوط میسور کی تاریخ ڈالی گئی تا کہ اس کالج کا قیام ایک ایسی تاریخی یادگار رہے جو ہند میں مسلمانوں کی اہم ترین ہزیمت کا دن تھا اور انگریزوں کی دانست میں ان کے سب سے خطرناک اور اہم ترین دشمن سلطان ٹیپو کی شہادت کی صورت میں ایک شاندار فتح کا دن بھی تھا۔ کالج کی باضابطہ داغ بیل ۱۰ رجولائی ۱۸۰۰ء کو ڈالتے ہوئے اس تاریخ کو گورنر جنرل کی کونسل نے کالج کے آئین، قواعد، ضوابط

اور شرائط ملازمت کے مسودہ کی منظوری دی۔ اس دستاویز کی پیشانی کی عبارت میں یہ تحریر بھی ہے۔ ''ہزلارڈ شپ (ویلزلی) کے حکم خاص سے اس (دستاویز) پر ۴؍مئی ۱۸۰۰ء کی تاریخ ڈالی گئی جو میسور کے دارالسلطنت سرنگا پٹنم میں برطانوی افواج کی شاندار اور فیصلہ کن فتح کی پہلی تاریخ تھی۔'' (گل کرسٹ اور اس کا عہد، از: محمد عتیق صدیقی، ص ۱۳۷)

یعنی کہ جنگ آزادی کے مجاہد اعظم حضرت سلطان ٹیپو علیہ الرحمہ کی شہادت انگریزوں کے لیے بڑی خوشی کا دن تھا۔ بلکہ ایسی کامیابی کا دن تھا کہ انھیں یہ محسوس ہونے لگا کہ آج سے ہندوستان ہمارا ہے اور وہ لوگ اپنے کارناموں کو شیر میسور کی تاریخ شہادت سے منسوب کرنے لگے تاکہ ان کے لیے یادگار ہو مگر افسوس! اب ۴؍مئی کو اس مردِ میدان کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کرنے کی بجائے آپ کی شخصیت کو مجروح کرنے کی ناپاک کوششیں کی جاتی ہیں۔ کہیں شیر میسور کے نام سے کوئی کانفرنس ہو تو اس کے خلاف ریلی نکالی جاتی ہے، ملک میں موجود ٹیپو سلطان کے نام سے موجود ہر شے کے نام کو تبدیل کر کے خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جب کہ میسور کا یہ ببّر شیر ایسا عظیم مرد مجاہد ہے جس نے تن تنہا انگریزوں کو لوہے کے چنے چبوائے تھے اور جو ''اولین جدوجہد آزادی'' کا نمائندہ مجاہد تھا۔

بہادر شاہ ظفر: ۱۸۵۷ء کا ایک معمر سپاہی

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر ایک سچے ہندوستانی تھے اور ان کے سینے میں ایک محب وطن کا دل دھڑک رہا تھا۔ ان کے دردمند دل ہونے کا ایک اہم ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ خود پنشن دار تھے۔ پنشن ان کے اپنے اخراجات کے لیے کم پڑتی تھی لیکن انھیں میں سے وہ جمنا کے کنارے رہنے والے مفلسوں کو بھی بلاناغہ کھانا بھجوایا کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی اپنے آباو اجداد کی بے عزتی برداشت نہیں کی اور نہ ہی انگریزوں کے سامنے شکست تسلیم کی۔ انگریزوں کے سامنے انہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ بادشاہ ہی پیش کیا۔ وطن دوستی کا یہ عالم کہ ان کے ہاتھ سے سب کچھ چھن گیا، یہاں تک کہ ان کے بیٹے اور پوتے (مرزا خضر، مرزا قویش، مرزا مغل، مرزا عبداللہ اور مرزا ابوبکر) تک کو شہید کر کے ان کے سر بادشاہ کے سامنے

پیش کیے گئے۔ان کے محافظِ خاص بخت یار شاہ اور شاہ سمند خان کو قتل کر دیا گیا۔ مفتی صدرالدین آزردہؔ، مصطفیٰ خاں شیفتہؔ اور مولانا فضل حق خیرآبادی پر مقدمے دائر کیے گئے اس کے باوجود بہادر شاہ ظفر کے حوصلے پست نہیں ہوئے، ایسے عالم میں بھی ان کے ارادے مستحکم نظر آتے ہیں۔اس بات کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ برطانوی حکومت کے اسیر تھے،لال قلعے کی دیواروں سے باہر جن کی حکومت کا کوئی وجود نہ تھا، وہی بہادر شاہ ظفر ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستان کی مزاحمت کی علامت بن گئے۔ ہندوستانی ذہن ان کی بادشاہت کو قبول کر چکا تھا۔ ہندوستانی مجاہدین نے میرٹھ سے دلّی کے لال قلعے تک اسی اُمید میں سفر کیا تھا کہ بہادر شاہ ظفر اس جنگ میں روحانی،نظریاتی، اخلاقی اور یہاں تک کہ جسمانی طور پر بھی ان کی قیادت کریں گے۔ عملاً یہ بات بہادر شاہ ظفر کے لیے کس قدر دشوار تھی، اس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں، مگر انہوں نے ہر محاذ پر ساتھ دینے کا عہد کیا۔ اگر چندلوگ دغابازی نہیں کرتے اور انگریزوں کی مخبری نہیں کرتے تو شاید مغل فرماں روائی کا یہ سلسلہ دراز ہوتا اور ہندوستان کی تاریخ جدا ہوتی۔

مئی ۱۸۵۷ء میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں تقریباً ساڑھے چار مہینے جنگ ہوئی مگر بہادر شاہ ظفر کو بھی شکست فاش ہوئی اور آخر کار ایسٹ انڈیا کمپنی کا عمل دخل ختم ہوکر ہندوستان پر براہِ راست ملکۂ برطانیہ کی حکومت قائم ہوگئی۔ ۲۱ ستمبر کو بہادر شاہ ظفر کو قید کرلیا گیا، بادشاہ کے بیٹے مرزا مغل، مرزا ابوبکر اور پوتے خصر سلطان کو مسٹر ہڈسن نے گولی کا نشانہ بنایا، سرتن سے جدا کیا گیا اور سَروں کو خوان میں سجا کر بادشاہ کے سامنے تحفۃً پیش کیا گیا۔ بادشاہ کو مع اہل وعیال رنگون بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے حسرت و یاس کے عالم میں نومبر ۱۸۶۲ء میں انتقال فرمایا ؎

عزت تیری قائم ہے میرے لال قلعے سے
تاج و قطب مینار کی دیوار و در سے
میسور میں سوئے ہوئے ٹیپو کی قبر سے
بنگال کے سراج سے دلّی کے ظفر سے

انقلاب ۱۸۵۷ء اور اردو صحافت

انقلاب ۱۸۵۷ء میں مجاہدین آزادی، محبان وطن، شعرا اور ادبا نے بھی حصہ لیا۔ چنانچہ حاتمؔ، قائمؔ، میرؔ، سوداؔ، شیفتہؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، مرزا داغ دہلویؔ، اور غالبؔ نے اہل وطن کی بدحالی اور بے چارگی کو اپنے شہر آشوب، رباعی، نظموں اور خطوط میں تحریر کیا ہیں۔ انگریزوں نے دہلی کے مکینوں پر بہت ظلم وستم ڈھایا جس کے سبب بہت سے اہل کمال نے دلّی سے ہجرت کی۔ سوداؔ، میرؔ، مصحفیؔ، سوزؔ، انشاؔ، جرأتؔ اور دیگر باکمال شخصیات نے لکھنؤ اور دیگر اردو ادب کے دلدادہ شہروں کی جانب رخت سفر باندھا۔ ان کو دلّی سے ہجرت کرنے کا کس قدر قلق ہوا ہوگا؟ اس لیے کہ یہ نامی گرامی شعرا دلّی کی آن بھی تھے اور دلّی کی جان بھی۔ میرؔ کہتے ہیں ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

مفتی صدر الدین آزردہؔ اپنے شہر آشوب ”فغان دہلی“ میں لکھتے ہیں ؎

عیش وعشرت کے سوا کچھ بھی نہ تھا جن کو یاد
لٹ گئے، کچھ نہ رہا، ہوگئے بالکل برباد
ٹکڑے ہوتا ہے جگر سن کے یہ ان کی فریاد
پھر بھی دیکھیں گے الٰہی کبھو دہلی آباد

مرزا داغؔ کے شہر آشوب کا ایک بند ؎

زمین کے حال پہ اب آسمان روتا ہے
ہر اک فراقِ مکیں میں مکان روتا ہے
کہ طفل و عورت و پیر و جوان روتا ہے
غرض یہاں کے لیے اک جہاں روتا ہے

جو کہے جوششِ طوفان نہیں کہی جاتی
یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

پروفیسر حامد کاشمیری اپنے مضمون ''اردو شاعری اور جدوجہد آزادی'' میں لکھتے ہیں: ''اہل ہند کے دلوں میں انقلاب کی چنگاری دراصل اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہی میں سلگ اٹھی تھی۔ وہ ملکی انتظامیہ کے خلل پذیر ہونے کے نتیجے میں غیر یقینیت اور عدم تحفظیت کا سامنا کر رہے تھے۔ اس زمانے میں مختلف حملہ آوروں نے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجادی ۔۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے مغل فوج کو شکست دے کر دہلی میں قتل عام کا حکم دیا۔ اس کے بعد جاٹوں نے بغاوت کی۔ ۱۷۵۴ء میں احمد شاہ ابدالی نے حملہ کر کے دہلی کو تاراج کیا۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے محمد شاہ کے عہد میں دہلی پر قبضہ کیا۔ (۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی، ص ۱۳)

جہاں تک مرزا غالبؔ کا تعلق ہے، وہ فرنگیوں کے جور و تطاول کے چشم دید گواہ تھے، انہوں نے غیر مبہم انداز میں اپنے خطوط میں اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور حب الوطنی اور جذبہ آزادی کا اظہار کیا ہے، ان کی دیکھتی آنکھوں کے سامنے قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ وہ منشی ہر گوپال تفتہ کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون، گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔''

ظاہر ہے غالب نے انقلاب ۱۸۵۷ء کو بھگتا بھی اور جھیلا بھی، ان کی خاندانی امارت چھن گئی، پنشن بند ہو گئی، ان کے بھائی یوسف مرزا بے کسی کے عالم میں انتقال کر گئے۔ انہوں نے انگریزوں کے ہاتھوں ظلم و تشدد کے دل دوز مناظر دیکھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تاثرات، واردات اور مشاہدات کا اظہار کھل کر اپنے خطوط میں کیا۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے انہوں نے سوائے چند اشعار کے صحافتی انداز اختیار نہ کیا۔ اسی لیے شمیم طارق نے جن کی فروری ۲۰۰۲ء کی مطبوعہ کتاب ''غالب اور ہماری تحریک آزادی'' میں صرف اس نکتۂ خاص کو توجہ کا محور بنایا ہے کہ غالبؔ کے دل میں آزادیِ وطن کی خاطر مسلح مزاحمت کاروں کے لیے احترام یا ہمدردی کا کوئی جذبہ موجود نہ تھا۔

بہرحال ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو کارگر بنانے میں اردو صحافت نے بھی اپنا تاریخی رول ادا کیا ہے۔انگریزوں کے ملک پر قابض ہونے تک تقریباً پینتالیس اردو اخبارات شائع ہوئے۔صادق الاخبار، دہلی، اردو اخبار (ایڈیٹر محمد باقر)، رفیق ہندی، ہزار داستان (ایڈیٹر محمد سلطان عاقل)، سلطان الاخبار، اودھ پنچ، دبدبۂ سکندری (ایڈیٹر ریاض خیرآبادی) اور بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان اخبارات کے مدیران اور مالکان کو سزائیں دی گئیں بلکہ دہلی اردو اخبار کے ایڈیٹر محمد باقر (محمد حسین آزاد کے والد) کو دہلی دروازے کے باہر میدان میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔(محمد حسین آزاد، از: نند کشور وکرم، ص ۱۰)

غرضیکہ آزادیِ ہند میں اردو زبان وادب نے اپنی بے مثال خدمات انجام دی۔اس بات کی دلیل کے لیے اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ ''انقلاب'' کا نعرہ سب سے پہلے اُردو زبان ہی میں دیا گیا اور اُردو کے متوالوں نے اس نعرے کو پورے ہندوستانیوں تک پہنچایا بھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک ہندوستان میں آزادی کے لیے جہد وجہد اور کاوشیں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں۔

دو اہم مسائل

۱۸۵۷ء میں اردو صحافت اور علمائے کرام کا کردار ایک مستقل عنوان ہے جس پر بہت سا کام ہوا ہے اور بہت کچھ ہونا باقی ہے۔مگر اس میں دشواری یہ ہے کہ دہلی سلطنت کے قیام کے بعد حکومت کی سرکاری زبان فارسی رہی اور برٹش حکومت کے قیام کے بعد بھی ۱۸۹۱ء تک سرکاری زبان فارسی ہی رہی اور ایک بڑا مواد فارسی زبان وادب میں موجود ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ برٹش دور میں اردو زبان میں کام بھی حکومتی طور پر شروع ہوا۔نتیجے میں ۱۸۵۷ء پر کثیر مواد ان دونوں زبانوں میں موجود ہے۔ ۱۸۵۷ء پر کثیر تعداد میں دستاویزات نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی و بھوپال، اترپردیش آرکائیوز لکھنؤ والہ آباد، مدھیہ پردیش اسٹیٹ آرکائیوز بھوپال، بہار اسٹیٹ آرکائیوز پٹنہ، دہلی اسٹیٹ آرکائیوز دہلی، کمشنرز ریکارڈس آفس دہلی اور مخطوطات کی شکل میں مواد ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، خدا بخش لائبریری پٹنہ، رضا

لائبریری رامپور، ہریانہ اسٹیٹ آرکائیوز چنڈی گڑھ، راجستھان اسٹیٹ آرکائیوز بیکانیر میں موجود ہے۔اس کے علاوہ اتر پردیش کے مختلف اضلاع کے محافظ خانوں میں بھی موجود ہے۔ان دستاویزات کے ساتھ دوطرح کے مسائل درپیش ہیں۔اول تو ان کی بقا کا مسئلہ ہے۔ان دستاویزات کو رکھے رکھے ۱۶۰رسال گزر گئے اور نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی کے علاوہ تمام آرکائیوز میں ایئر کنڈیشننگ کا انتظام نہیں ہے جس کے نتیجے میں اتنے اہم دستاویزات ایک مخصوص درجۂ حرارت میں محفوظ نہیں ہیں اور موسم وحرارت کے تغیر کے سبب انھیں سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔دوسرا مسئلہ ان دستاویزات کے مطالعہ کا ہے۔یہ دستاویزات زیادہ تر ''خط شکستہ'' میں ہیں جن کا پڑھنا نہایت مشکل کام ہے۔اردو سے ماسٹر ڈگری ہونے کے باوجود بھی ماسٹر ڈگری ہولڈرس اسے پڑھ نہیں پاتے ہیں۔لہٰذا اردو ادب کے ایسے فعال حضرات کو آگے آنا چاہیے جو ان تاریخی دستاویزات کو اردو میں خط نستعلیق میں اور دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کا ترجمہ کریں تا کہ ہر کوئی اس سے استفادہ کر سکے اور جانے کہ ہند کی آزادی میں غیروں نے جتنا پسینہ نہیں بہایا ہے اس سے کہیں زیادہ خون مسلمانوں کا بہایا گیا ہے۔

فرضیت جہاد کا فتویٰ

۱۸۵۷ء میں علمائے اہلسنّت نے اپنی جان و مال اور عزت وآبرو کا خیال کئے بغیر انگریزوں کے خلاف فرضیت جہاد کا فتویٰ صادر کیا۔ان میں خاص طور پر علامہ فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا فیض احمد رسوا بدایونی، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا کفایت علی کافی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی، مولانا امام بخش صہبائی دہلوی، مولانا وہاج الدین مرادآبادی اور مولانا رضا علی خاں بریلوی قابل ذکر ہیں۔فتویٰ جہاد کے صدور کے بعد ہزارہا ہندوستانی اپنی ہتھیلیوں پر سروں کا نذرانہ لیے آزادی کے لیے انگریزوں سے برسرپیکار ہوئے مگر افسوس یہاں بھی بعض وجوہات کی بنا پر مسلمانوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔چوں کہ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے لی تھی اور مسلمان ہی آزادی کی لڑائی میں پیش پیش تھے اس لیے اس کا خمیازہ صرف اور صرف

مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔ انگریز اپنے انتقام میں ایسے اندھے ہو گئے کہ انھیں برادرانِ وطن کا خیال ہی نہیں رہا، انھیں اعزازی نوکریاں ملنے لگیں اور مسلمان ہر جگہ سے بے دخل کئے جانے لگے۔ مختصر یہ کہ بغاوت کی ساری ذمہ داری مسلمانوں ہی کے حصے میں آئی ؎

آکے پتھر تو مرے صحن میں دوچار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے

ظلم و جبر کی لرزہ خیز داستان

۱۸۵۷ء کی بغاوت کو کچلنے میں انگریزوں نے کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ چنانچہ علامہ فضل حق خیر آبادی "الثورۃ الہندیہ" میں رقمطراز ہیں:

"اس ابتلائے عظیم میں پردہ نشین خواتین پیدل نکل کھڑی ہوئیں، ان میں بوڑھی اور عمر رسیدہ بھی تھیں، جو تھک کر عاجز ہو گئیں۔ بہت سی خوف سے جان دے بیٹھیں اور بچاسوں عفت و عصمت کی بنا پر ڈوب کر مر گئیں، اکثر پکڑ کر قیدی بنائی گئیں اور طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہو گئیں۔ کچھ کو بعض رذیلوں نے لونڈیاں بنالیا اور بعض چند ٹکوں کے بالعوض بیچ ڈالی گئیں۔ بہت سی بھوک پیاس کی تاب نہ لا کر مر گئیں۔ بہت سی ایسی غائب ہوئیں کہ پھر نہ تو لوٹ کر ہی آئیں، نہ ان کا کچھ پتہ ہی چل سکا۔ ہزاروں عورتیں اپنے سرپرستوں، شوہروں، باپوں، بیٹوں اور بھائیوں سے جدا کر دی گئیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بہت سی صبح کی سہاگن عورتیں شام کو بیوہ بن گئیں اور شب کو آغوشِ پدر میں سونے والے بچے صبح کو یتیم ہو کر اُٹھے۔ کتنی ہی عورتیں اپنی اولاد وغیرہ کے غم میں گریہ وزاری کرتی تھیں اور کتنے مردوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری تھا۔ شہر چٹیل میدان اور بے آب وگیاہ جنگل بن گیا تھا۔" (باغی ہندوستان، ص ۵۱۔ ۵۳)

۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۷ء تک انگریزوں نے علما کو ہلاک کرنا شروع کیا۔ ایک انگریز فوجی افسر ہنری کوٹن (Henry Cotton) بیان کرتا ہے کہ "دہلی دروزہ سے پشاور تک گرینڈ ٹرنک روڈ کے دونوں ہی جانب شاید ہی کوئی خوش قسمت درخت ہوگا جس پر انقلاب ۱۸۵۷ء کے ردّعمل اور اسے کچلنے کے لیے ہم نے ایک یا دو عالمِ دین کو پھانسی پر نہ لٹکایا ہو۔

ایک اندازے کے مطابق تقریباً بائیس ہزار علما کو پھانسی دی گئی۔"

مسلمان مجاہدین نامی کتاب میں ایک غیر مسلم مؤرخ لکھتا ہے کہ "ایک اندازہ کے مطابق ۱۸۵۷ء میں پانچ لاکھ مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ جو بھی معزز مسلمان انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا اس کو ہاتھی پر بٹھایا گیا اور درخت کے نیچے لے گئے۔ پھندا اس کی گردن میں ڈال کر ہاتھی کو آگے بڑھایا گیا، لاشیں پھندے میں جھول گئیں، آنکھیں اُبل پڑی، زبان منہ سے باہر نکل آئی۔" (علمائے اہلسنّت کی بصیرت و قیادت، ص ۸۰)

ان تین سالوں میں چودہ ہزار علمائے کرام تختۂ دار پر چڑھائے گئے۔ دہلی میں چاندنی چوک کے اِردگرد دور دور تک ایسا کوئی درخت نہیں تھا جس پر علما کی گردنیں نہ لٹکی ہوں۔ علما کو سؤروں کی کھالوں میں بند کر کے جلتے ہوئے تنوروں میں ڈالا گیا۔ علما کے جسموں کو تانبوں سے داغا گیا۔ علما کو ہاتھیوں پر چڑھا کر درختوں سے باندھا گیا اور ہاتھیوں کو پھر چلا دیا جاتا۔

انگریزی رائٹر مسٹر ایڈورڈ ٹامسن "تصویر کا دوسرا رخ" نامی کتاب میں لکھتا ہے کہ ہاتھیوں کو اس طرح چلانے سے پھانسی لگنے والے شخص کا بدن انگریزی کے آٹھ (8) کے جیسا ہوجاتا۔ لاہور کی شاہی مسجد میں ایک دن میں اَسّی اَسّی علمائے کرام کو پھانسی دی جاتی تھی۔ لاہور کے دریائے راوی میں علما کو بوریوں میں بند کر کے بہا دیا جاتا اور اوپر سے گولیاں چلائی جاتیں۔ غرضیکہ ایسے ایسے مظالم ڈھائے گئے جن کی تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

دنیا سے آج پوچھو پیچھے نہیں ہیں ہم
انگریز سے رہا تھا جب امتحاں ہمارا
زد میں بھی گولیوں کی مقصد نہ ہم نے چھوڑا
قیدوں میں بھی نہ بدلہ عزم جواں ہمارا
ریلوں میں راستوں میں جیلوں میں محفلوں میں
نعرہ تھا ہم کو دے دو ہندوستاں ہمارا

المختصر ذیل میں ان باہمت، سرخیل اور اسلام کے ان بدرجلیل مجاہدین کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جنہوں نے آزادی کے لیے انمول کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

علامہ صدر الدین آزردہ دہلوی: جنگ آزادی کے عظیم قائد و جرنل

سرمایۂ نازشِ ہندوستان مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی (متولد ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۹ء۔ متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) کے آباواجداد کشمیر کے تھے مگرآپ کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ مفتی صدر الدین آزردہ تمام علوم نحو، صرف، منطق، حکمت، ریاضی، معانی، بیان، ادب ،انشا، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں یدِطولیٰ رکھتے تھے اور درس دیتے تھے۔ آپ ۱۸۲۷ء سے ۱۸۵۷ء تک دہلی کے صدر امین اور صدر الصدور رہے۔ آپ کا دولت کدہ اس وقت کے اکابر علما وفضلا وادباوشعرا کا مرکز تھا۔ مفتی صاحب کے حلقے میں علامہ فضل حق خیرآبادی، مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبداللہ خان علوی، حکیم مومن خان مومن، مرزا اسداللہ خاں غالب، نواب ضیاء الدین خاں نیر، شاہ نصیر الدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا جان عیش، حافظ عبدالرحمن خاں احسان اور میر حسن تسکین جیسے سخنوران باکمال، کہنہ مشق شاعرا وراديب تھے۔

''گل رعنا'' میں صفحہ ۲۲۷ پر حکیم عبدالحئی رائے بریلوی لکھتے ہیں کہ ''جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔''(چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء ، ص ۴۱) آپ کی جامعیت، قوت حافظہ، حسن تحریر، متانت تقریر، فصاحتِ بیان، بلاغتِ معانی اور فنون ادبیہ میں کامل دسترس کا اعتراف کرتے ہوئے حکیم عبدالحئی لکھتے ہیں کہ ''سرزمین ہند میں اس جامعیت کے دو چار ہی ایسے اشخاص ہوئے ہوں گے۔ اس کے ساتھ مزاج دیکھو تو خلق مجسم اور لطفِ مصور، علم وکمال میں بقول شیفتہ ''در فنون ادبیہ ثانی اعشیٰ و جریرست و در مراتب حکمیہ ثالث باقر ونصیر۔''(مرجع سابق، ص ۴۴)

مفتی صدر الدین آزردہ صاحب ایک طرف جلیل القدر عالم دین تھے تو دوسری طرف آبروئے شہر تھے۔ آپ کی بصیرت وقیادت اور علمی استعداد کا سکہ پورے ملک میں قائم تھا۔ ''تاریخ عروج انگلشیہ'' میں صفحہ ۱۷۱ پر منشی ذکاءاللہ دہلوی جامع مسجد دہلی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''دہلی کی جامع مسجد جو شہر کی تمام مسجدوں کی ناک تھی انگریزوں نے ایسے نکٹا

بنادیا کہ سپاہ کی بیرک اس کو بنایا۔ اس میں پیشاب پاخانہ سے پرہیز نہ کیا۔ سکھوں نے سُور ذبح کرکے پکائے۔ کتے جو انگریزوں کے ساتھ تھے وہ درگاہ شریف میں پڑے پھرتے تھے۔" (مرجع سابق، ص ۴۵)

عہد مغلیہ کی اس اہم تاریخی یادگار کو مفتی صدرالدین آزردہ صاحب نے انگریزوں کے دوسالہ قبضے سے نومبر ۱۸۶۳ء میں واگذار کرایا۔

"۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ" صفحہ ۲۷ پر عبدالرحمن پرواز اصلاحی لکھتے ہیں: "مفتی صاحب انگریزی صدرالصدور ہوتے ہوئے بھی انگریزوں کے حامیوں کی صف میں شامل ہونے کے بجائے ۱۹؍رمضان ۱۲۷۳ھ/ مطابق ۱۲؍مئی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر کے دربار میں شامل ہوئے۔" (مرجع سابق، ص ۵۳)

بہادر شاہ ظفر کو بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ جو کام دوسرے نہیں کرا سکتے، مفتی صاحب کرا سکتے ہیں۔ مفتی صاحب میں معاملات سلجھانے کی خداداد صلاحیت تھی۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے وقت بعض مواقع بڑے نازک آئے لیکن مفتی صاحب کی دانش مندی نے ان موقعوں پر معاملہ بگڑنے نہ دیا۔ ایسے نازک حالات میں ایک مسئلہ یہ کھڑا ہوگیا تھا کہ ایک گروہ نے قربانی کے متعلق یہ منادی کردی تھی کہ گائے کی قربانی ہرگز نہ ہونے پائے۔ شاہ غلام علی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین مولانا شاہ احمد سعید نقش بندی مجددی دہلوی نے اس گروہ کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ مفتی صاحب ہی کی کاوش سے یہ مسئلہ حل ہوا اور مسلمان متحد ہوکر انگریزوں کے خلاف سینہ سپر ہوئے۔ ان واقعات اور دیگر تاریخی روایات سے مغل حکومت کے ساتھ مفتی صاحب کی ہم دردانہ وابستگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اچھی طرح یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ وہ انگریزوں کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے دوران جنرل بخت خاں روہیلہ جب چودہ ہزار انقلابیوں کی فوج لے کر بریلی سے آغازِ جولائی کو دہلی پہنچا تو علمائے دہلی کی طرف سے انگریزوں کے خلاف ایک فتویٰ جاری ہوا، اس فتویٰ جہاد پر ۳۸؍مفتیان کرام کے دستخط تھے، جن میں مفتی صاحب بھی شامل تھے۔ یہ فتویٰ "اخبار الظفر" دہلی میں شائع ہوا تھا۔ وہاں سے اس کی نقل

انھیں دنوں ''صادق الاخبار'' دہلی میں مورخہ ۲۶ رجولائی ۱۸۵۷ء میں چھپی تھی۔ یہ اخبار نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہے۔ اس فتویٰ کو عکس ''سوتنتر دہلی'' ہندی اور ''نوائے آزادی'' میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ (مرجع سابق، ص ۵۶)

مفتی صدرالدین آزردہ صاحب کا ایک بڑا سیاسی کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے جنگ آزادی کے مجاہد اعظم مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی کو یہ مشورہ دیا کہ آپ دہلی کی بجائے آگرہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں۔ پھر آپ ہی نے اپنے خط کے ذریعے شاہ صاحب کا تعارف آگرہ کے ان زعما و علما سے کرایا جو ایک طرف سرکاری حلقوں میں باوقار تھے تو دوسری جانب قومی وملی کارکنوں کا اعتماد ان کو حاصل تھا۔ حضرت مفتی صاحب کے تعارفی خط نے اساس و بنیاد کا کام کیا۔ دارالحکومت آگرہ کے اعلیٰ سیاسی طبقہ میں ایک غیر معروف شخص کے لیے رسوخ اور اعتماد حاصل کرنے کی کٹھن منزل جو سالہا سال میں طے ہوتی مفتی صاحب کا مکتوب گرامی اور سیاسی حلقوں میں مفتی صاحب کا گہرا تعلق ہی تھا جس نے اس کو نہایت آسانی سے چند لمحوں میں طے کرا دیا۔ آپ کا درِ دولت جس طرح سے عام حالات میں مرجع رہا کرتا تھا اس وقت بھی انقلابی عناصر کا پناہ گاہ بنا رہا۔ انگریزوں کے سب سے خطرناک دشمن جن کو مجاہدین کہا جاتا تھا جن کی انگریز دشمنی کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری کی بنا پر نہیں تھی بلکہ ان کی حریت پسند فطرت نے اس کو عقیدہ کی حیثیت دے رکھی تھی۔ ان سربکف مجاہدین کا ہجوم جس کے درِ دولت پر رہتا تھا وہ مفتی صدرالدین صدرالصدور ہی تھے۔

مفتی صاحب کو ۱۸۵۷ء میں انگریزی فوج کے ہنگامۂ فساد میں بہت سخت صدمہ اٹھانا پڑا۔ تعلق روزگار بھی ہاتھ سے گیا اور تمام جائداد واملاک بھی جو آپ نے تیس سالہ ملازمت کے دوران جمع کی تھی ضبط ہو گئی بلکہ جہاد کے فتویٰ کے الزام میں چند ماہ تک جیل خانہ میں بھی بند رہے۔ چوں کہ آپ کا قصور ثابت نہ ہو سکا اس لیے رہا کر دیئے گئے۔ اکیاسی سال کی عمر میں بمرض فالج ۱۶ رجولائی ۱۸۶۸ء کو مفتی صاحب کا انتقال ہوا اور چراغ دہلی میں احاطۂ حضرت نصیرالدین محمود چراغ دہلوی میں تدفین عمل میں آئی۔

علامہ فضل حق خیر آبادی:
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے محرک اوّل

تحریک آزادی کے محرک اوّل حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی (متولد ۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء۔متوفی ۱۲۷۸ / ۱۸۶۱ء) کی ولادت دہلی کی صدرالصدور حضرت علامہ فضل امام فاروقی خیرآبادی کے یہاں ہوئی۔آپ نے اپنے والد کے علاوہ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے تعلیم وتربیت حاصل کی۔تیرہ سال کی عمر میں علوم نقلیہ وعقلیہ کی تکمیل کر لی۔آپ ایک یگانۂ روزگار عالم تھے۔عربی زبان کے مانے ہوئے ادیب اور شاعر تھے۔علوم عقلیہ کے امام اور مجتہد تھے۔اوران سب سے بالا یہ خصوصیت تھی کہ وہ بہت بڑے سیاست داں، مفکر اور مدبر بھی تھے۔مسند درس پر بیٹھ کر علوم وفنون کی تعلیم دیتے اور ایوان حکومت میں پہنچ کر دُوررَس فیصلے کرتے تھے۔آپ بہادر وشجاع بھی تھے۔ صدرالصدور، حضور تحصیل، سررشتہ دار اور دیگر کئی بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔

محمد حسین آزاد مرزا غالبؔ کے دیوان کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی معروف کتاب ''آبِ حیات'' میں لکھتے ہیں کہ: ''علامہ فضل حق خیرآبادی نے ہی مرزا غالبؔ کے دیوان سے مشکل اشعار نکال کر اسے ایسا بنا دیا کہ لوگ آج اسے عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔'' (۱۸۵۷ء پس منظر وپیش منظر، ص ۲۱۶)

تذکرۂ شعرائے اردو موسوم بہ گل رعنا میں مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب لکھتے ہیں: ''جب مولانا فضل حق نے روک ٹوک شروع کی تو ان کے کان کھڑے ہو گئے، مولانا حالی لکھتے ہیں کہ مولانا کی تحریک سے مرزا نے اپنے کلام سے دوثلث کے قریب اشعار نکال ڈالے اور اس کے بعد اس روِش پر چلنا چھوڑ دیا۔ (گل رعنا، ص ۲۱۳)

دہلی میں علما کی دو جگہ نشست تھی۔ایک علامہ فضل حق کے یہاں اور دوسرے مفتی صدرالدین آزردہؔ کے دولت کدہ پر۔علامہ کے علمی دربار میں آٹھویں روز شعرائے دہلی کا

اجتماع ہوتا تھا۔غالبؔ،صہبائیؔ،مومنؔ،آزردہ،احسانؔ،نیرؔ،نثارؔ،شیفتہؔ،ضمیرؔ،ممنونؔ،نصیرؔ، وغیرھم۔اور علما میں وقت کے جید اور جلیل القدر علماء کا جم غفیر ہوتا تھا۔

علامہ عبدالشاہد شیروانی لکھتے ہیں کہ ''اندازہ لگایئے کہ اکبر بادشاہ کے شاہی دربار سے یہ دربار کسی طرح کم تھا؟ بادشاہ نے لاکھوں روپے صرف کر کے نورتن جمع کیے تھے اور ان شاہان علم نے اپنے حسن اخلاق سے سینکڑوں باکمال حضرات کو درباری بنالیا تھا۔''(باغی ہندوستان،ص ۱۶۲۔۱۶۳)

انقلاب ۱۸۵۷ء میں علامہ فضل حق خیرآبادی نے کلیدی رول ادا کیا۔مولانا محمد شاہد شیروانی،علامہ یاسین اختر مصباحی اور مولانا خوشتر نورانی صاحب نے علامہ کی انقلابی سرگرمیوں کا تذکرہ مختلف حوالاجات سے اس طرح کیا ہے۔علامہ نے دہلی کے مرکز جہاد میں بھی حصہ لیا اور اودھ کے مرکز جہاد میں بھی۔معرکۂ ستاون کے دوران بہادر شاہ ظفر کو علامہ مخلصانہ مشورہ دیتے رہے اور بہادر شاہ اس اعتماد کی بنا پر جو اسے علامہ کے اخلاص اور ان کی اصابت رائے پر تھا،ان مشوروں پر عمل کیا کرتے تھے۔(مختلف دستاویزات)مجاہدین کی اعانت روپے اور سامان رسد سے،اہل کار حکام کا تقرر،مال گزاری کی تحصیل کا انتظام اور ہمسایہ والیان ریاست کو جنگ میں اعانت وشرکت کی دعوت کے لیے لال قلعہ کے دارالانشاء (سکریٹریٹ)سے علامہ کے حکم سے بہت سے پروانے جاری ہوئے۔

دہلی پر انگریزوں کا کامل تسلط ۱۸۰۳ء میں شاہ عالم ثانی کے عہد میں ہو چکا تھا اور مغل بادشاہت برائے نام رہ گئی تھی۔ستاون کا انقلاب برپا ہونے کے بعد علامہ نے بہادر شاہ کی شہنشاہی کو دستوری حکومت اور آئینی بادشاہت میں تبدیل کرنے کے لیے باقاعدہ ایک دستور العمل بنایا جس کا نفاذ بھی عمل میں آیا تھا اور آپ کا یہ ''دستور العمل سلطنت''،''سیاست نامہ'' اور ''البدور البازغہ'' کی سی اہمیت اور قدر و قیمت کا حامل تھا جو اگست ۱۸۵۷ء کے آخری عشرے میں بن گیا تھا۔(۱۸۵۷ء پس منظر و پیش منظر،ص ۲۲۱)

غیر ملکی غاصبوں کے خلاف اہل وطن کی متفقہ جدوجہد کے لیے علامہ نے ہندو مسلم اتحاد کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔علامہ دیگر علمائے دہلی کے ساتھ جلسے کر کر کے ترغیب جہاد کے لیے وعظ کرتے رہے کہ حملے کی شکل میں دارالاسلام کو بچانے کی فکر و کوشش شرعاً واجب

ہے۔معرکے کے دوران علامہ نے شاہی فوج کی کمان بھی کی۔ بہادر شاہ نے جنگ کے ایام میں سہ رکنی ''کنگ کونسل'' بنائی جس کے ایک رکن علامہ بھی تھے۔(دی گریٹ ریولیوشن آف 1857، بحوالہ: علامہ فضل حق اور انقلاب ۱۸۵۷ء، ص ۱۳۱)علامہ نے سلطنت کا جو دستور العمل بنایا تھا اس کے نفاذ کے لیے ایک مجلس منتظمہ تشکیل دی گئی، جس کا ڈائرکٹر (نگراں) علامہ کو بنایا گیا۔ ۱۹ر ستمبر کو دہلی پر انگریزی حکومت کا قبضہ ہو جانے کے بعد علامہ اودھ میں بیگ حضرت محل کے ساتھ سرگرم ہو گئے۔

مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ اور دوسری چھاؤنیوں میں کارتوسوں کا قضیہ زور پکڑ چکا تھا۔ گائے اور سور کی چربی کی آمیزش کی خبر سے مسلم اور ہندو فوجی بگڑ بیٹھے تھے۔ علامہ عبدالشاہد شیروانی لکھتے ہیں:

''علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورہ کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد (دہلی) میں علما کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدرالدین آزردہ، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی اور سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کیے۔ اس فتوی کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی۔(تاریخ ذکاء اللہ، بحوالہ: باغی ہندوستان، ص ۲۱۵)

۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی پر پوری طاقت وقوت کے ساتھ حملہ کیا اور دہلی پر مکمل ان کا قبضہ ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر گرفتار کر لیے گئے۔ ۱۸۵۹ء میں علامہ فضل حق خیرآبادی پر لکھنؤ میں مقدمہ چلا۔ سرکاری وکیل کے مقابل خود علامہ صاحب بحث کرتے تھے۔ بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزامات خود اپنے اوپر قائم کرتے اور پھر خود مثل تارِ عنکبوت عقلی وقانونی ادلّہ سے توڑ دیتے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہم دردی بھی تھی۔ کرے تو کیا کرے؟ ظاہر یہ ہو رہا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے۔ غدر کے بعد نہ جانے کتنے سورما اور رزم آرا ایسے تھے جو گوشۂ عافیت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ لیکن مولانا ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے کیے پر نادم اور پشیمان نہیں تھے۔ آپ نے سوچ سمجھ کر میدان جہاد میں قدم رکھا تھا۔ اپنے اقدام کے نتائج برداشت کرنے کے لیے آپ حوصلہ

مندی اور دلیری کے ساتھ تیار تھے۔ سراسیمگی، دہشت اور خوف یہ ایسی چیزیں تھیں جن سے مولانا بالکل ناواقف تھے۔ آپ نے بھرے مجمع میں حق گوئی و بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جس مخبر نے فتویٰ کی خبر دی، وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔ چنانچہ آپ کو کالا پانی کی سزا ہوئی۔

علامہ فضل حق خیرآبادی امام الحکمۃ والکلام اور قائد جنگ آزادی ہونے کے ساتھ بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ دو درجن آپ کی تصانیف ہیں۔ منطق و فلسفہ کے دقیق فنی مباحث پر آپ کی کئی ایسی تصانیف و حواشی ہیں جنھیں آج چند علما ہی سمجھ پائیں گے۔ علامہ صاحب نے قید تنہائی میں رہتے ہوئے ''الثورۃ الہندیہ'' (باغی ہندوستان) تحریر کی جو انقلاب آزادی کا ایک مستند ترین ماخذ ہے۔ ''الثورۃ الہندیہ'' اور ''قصائد فتنۃ الہند'' (منظوم) کو علامہ نے جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) سے ۱۸۶۰ء (۱۲۷۷ھ) میں بذریعہ حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی اپنے فرزند مولانا عبدالحق خیرآبادی کے پاس کوئلہ اور پنسل سے کپڑا وغیرہ پر لکھ کر بحفاظت تمام بھیجا تھا۔ اس کتاب پر مولانا ابوالکلام آزاد نے تعارف لکھا اور مولانا محمد عبدالشاہد خاں شیروانی نے ۱۹۴۶ء کو ترجمہ کر کے شائع کیا۔ بعد ازاں المجمع الاسلامی مبارک پور سے حواشی اور بعض اہم مضامین کے اضافے کے ساتھ ''باغی ہندوستان'' کی اشاعت عمل میں آئی۔

جس دن آپ کے صاحبزادے اور معتقدین رہائی کا پروانہ لے کر کالا پانی پہنچے تو ایک جنازہ پر نظر پڑی، بڑا ازدحام تھا، معلوم ہوا کہ ۱۲رصفر ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء کو علامہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب سپرد خاک کرنے جارہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت و یاس شریک دفن ہوئے اور بے نَیلِ مَرام واپس لوٹے:

قسمت کی بدنصیبی! کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

علامہ صاحب کی قبر انڈمان کے ساؤتھ پوائنٹ (جسے عرفِ عام میں نمک بھٹہ کہتے ہیں) کی ایک ایسی بستی میں ہے۔ آپ کا مزار زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ (علامہ فضل حق اور انقلاب ۱۸۵۷ء، ص ۱۰۴)

آپ پر کئے گئے ظلم و ستم کی لرزہ خیز داستان بتاتے ہوئے علامہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

''دشمن کے ظلم وستم نے مجھے دریائے شور کے کنارے ایک بلند ومضبوط، ناموافق ہواوالے پہاڑ پر پہنچادیا جہاں سورج ہمیشہ سر پر رہتا تھا۔اس میں دشوار گزار راہیں اور گھاٹیاں تھیں، جنھیں دریائے شور کی نہریں ڈھانپ لیتی تھیں، اس کی نسیم صبح بھی گرم وتیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس کی نعمت زہر ہلاہل سے زیادہ مضر تھی۔اس کی غذا حنظل سے زیادہ کڑوی، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں۔۔۔۔ہوا بد بودار اور بیماریوں کا مخزن تھی۔مرض سستا اور دوا گراں۔ بیماریاں بے شمار، خارش وقوبا (وہ مرض جس سے بدن کی کھال پھٹنے اور چھلنے لگتی ہے) عام تھی ۔۔۔۔یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے۔بخار موت کا پیغام،مرض سرسام اور برسام (دماغ کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علت تام ہے۔بہت مرض ایسے ہیں جن کا کتب طب میں نام ونشان نہیں۔نصرانی ماہر طبیب مریضوں کی آنتوں کو تنور کی طرح جلاتا اور مریض کی حفاظت نہ کرتے ہوئے آگ کا قبہ اس کے اوپر بناتا ہے۔مرض نہ پہچانتے ہوئے دوا پلا کر موت کے منھ کے قریب پہونچادیتا ہے۔جب کوئی ان میں سے مرجاتا ہے تو نجس وناپاک خاکروب جو درحقیقت شیطانِ خناس یا دیو ہوتا ہے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا غسل وکفن کے بغیر اس کے کپڑے اتار کر ریت کے تودے میں دبادیتا ہے۔نہ اس کی قبر کھودی جاتی ہے، نہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اگر مسلمان کی خودکشی مذہب میں ممنوع اور قیامت کے دن عذاب وعتاب کو باعث نہ ہوتی تو کوئی بھی یہاں قید ومجبور بنا کر تکلیف مالا یطاق نہ دیا جاسکتا اور مصیبت سے نجات پالینا بڑا آسان ہوتا۔(باغی ہندوستان، ص۷۹)

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں
علامہ فیض احمد رسوا بدایونی کے دینی وسیاسی کارنامے

حضرت مولانا فیض احمد بن حکیم غلام احمد کی ولادت ۱۲۲۳ھ/ ۱۸۰۸ء میں مولوی محلہ بدایوں میں ہوئی۔تین سال کی عمر میں یتیم ہوگئے۔والدہ کے زیر سایہ تعلیم پا کر عالم وفاضل ہوئے۔آپ کے حقیقی ماموں حضرت علامہ فضل رسول بدایونی قدس سرہ نے آپ کی مکمل سرپرستی ونگہداشت کی۔چودہ سال کی عمر میں علوم نقلیہ وعقلیہ سے فارغ ہونے کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔معاصرین میں آپ امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔شاعری کا بھی اعلیٰ ذوق تھا، رسوا آپ کا تخلص تھا۔اپنے نانا حضرت شاہ عبدالحمید عثمانی بدایونی خلیفۂ شمس

العارفین حضرت سید شاہ آل احمد اچھے میاں قادری برکاتی مارہروی قدس سرہ سے آپ کو بیعت وارادت کے ساتھ خصوصی فیضان حاصل ہوا۔ بدایوں میں سلسلۂ تدریس کے بعد صدر نظامت آگرہ میں پیش کار اور پھر بورڈ آف ریونیو میں سررشتہ دار ہوئے۔ لفٹننٹ گورنر سرولیم میور نے آپ سے عربی سیکھی۔ ثروت ووقار کے باوجود دل فقیرانہ اور مزاج شاہانہ تھا۔ اہل وطن (بدایوں) کی آپ بڑی مدد کرتے تھے۔ وسیع اخلاق کے مالک تھے۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ ساتھ عیسائی مذہب نے بھی فروغ پایا۔ انگریزوں اور پادریوں نے ہندوستان کو مذہبی حیثیت سے بھی فتح کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ کمپنی کی تائید واعانت سے مذہب مسیحی کی تنظیم اور ترقی عمل میں آئی۔ ملک کے طول وعرض میں اس تنظیم کے آثار قائم کئے گئے۔ چرچ مشن سوسائٹی، بائبل سوسائٹی، مشن فنڈ اور مدارس جگہ جگہ قائم کئے گئے۔ مذہبی کتابوں اور رسائل کی اشاعت کے ذریعہ ہندوستانیوں کے رجحانات وعقائد سلب کرنے کی کوشش کی گئی۔ غرض یہ وہ زمانہ تھا کہ عیسائیوں نے ہندوستان میں اسلام کے خلاف زبردست مہم جاری کر رکھی تھی۔ پادری فنڈر (Fonder.Revd C.C.D) یورپ سے ہندوستان آیا، یہاں اس نے دل شکن تقریروں کا سلسلہ شروع کیا اور اس کی کتاب ''میزان الحق'' نے خوف وہراس پیدا کیا۔ پادری فنڈر نے آگرہ کو مناظرہ کا گڑھ ٹھہرایا۔ کیوں کہ آگرہ ہی اس وقت علما کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ پادری کا خیال تھا کہ اگر یہاں کسی طرح فتح ہوگئی تو عیسائیت کی تبلیغ میں بڑی مدد ملے گی۔ اس نے مشاہیر علما کو چیلنج دیا۔ ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء آگرہ میں مناظرہ کا پہلا اجلاس ہوا۔ اہل اسلام کی جانب سے مذہب عیسوی کے مشہور ماہر ومناظر مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور مناظر دوم ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی تھے۔ مولانا فیض احمد بدایونی ان کے دست راست اور معاون ومددگار تھے۔ تین روز تک مناظرہ ہوا۔ پادری فنڈر کو انجیل کی تحریف کا اقرار کرنا پڑا اور اس نے شکست فاش کھائی اور آگرہ سے راہ فرار اختیار کر کے سیدھا یورپ پہنچا۔ اس تاریخی مناظرہ میں مولانا فیض احمد بدایونی نے ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی کو ہر طرح مدد دی۔

ہندوستان کی قابل فخر تاریخی جامع مسجد آگرہ کا اس زمانہ میں عجیب حال تھا، اکثر حصے پر لوگوں نے قبضہ کر رکھا تھا، بیچ کے حصے میں صرف ستر اسی نمازی نماز ادا کر سکتے تھے۔ باقی

حصوں پر کبوتر بازوں اور رسیاں بٹنے والوں کا قبضہ تھا۔ مسجد کی دکانیں بنیوں کے پاس رہن تھی۔ مولانا بدایونی کی کاوش سے مسجد کا انتظام درست کیا گیا، دکانیں خالی کرائی گئیں، کبوتر بازوں کو نکالا گیا، مسجد میں رسّی بٹنے کا کام ختم کیا گیا اور مسجد کے انتظام کے لیے لوکل ایجنسی آگرہ کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت آج تک جامع مسجد آگرہ کا انتظام ہے۔ مولانا فیض احمد بدایونی کئی کتب ورسائل کے مصنف ومؤلف تھے مگر ان میں بیشتر کے مسودات انقلاب ۱۸۵۷ء کی افراتفری میں ضائع ہو گئے۔ تعلیم الجاہل مطبوعہ ۱۲۶۹ھ۔ المقامۃ البغدادیۃ (منثور) وھدیۂ قادریہ (منظوم) مطبوعہ ۱۳۰۳ھ آپ کی تحریری یادگاریں ہیں۔

میرٹھ اور دہلی میں علمِ انقلاب (۱۸۵۷ء) بلند ہوا تو اس کا فوری اثر آگرہ پر پڑا جو صوبائی حکومت کا مرکز تھا۔ مجاہدین فوج کی سرپرستی ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی اور مولوی فیض احمد بدایونی نے کی۔ دہلی کی شکست کے بعد جنرل بخت خاں کے ساتھ دونوں سرپرستوں نے فتوائے جہاد کی تشہیر کی۔ اس فتویٰ پر مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہؔ، مفتی فضل کریم اور مولوی عبدالقادر وغیرہ کے دستخط تھے۔ مذکورہ بالا حضرات کی موجودگی اور فتویٰ کی تشہیر کی وجہ سے بدایوں اور اس کے مضافات کے ہزاروں افراد مجاہدین میں شامل ہوئے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف بدایوں، جلد ۲، ص ۱۳۔ ۱۴، بحوالہ: چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء، ص ۸۸)

انقلاب ۱۸۵۷ء میں آپ اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر دہلی پہنچے اور یہاں جاری جنگ میں کھل کر حصہ لیا۔ کچھ دن تک شہزادہ مرزا مغل فرزند بہادر شاہ ظفر کے پیش کار رہے اور جنرل بخت خاں روہیلہ کے ساتھ انقلاب کی ناکامی کے بعد دہلی سے واپس چلے گئے۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں مولانا بدایونی نے ککرالہ (بدایوں) کے معرکے میں جنرل بخت خاں کے ساتھ دادِ شجاعت دی جہاں انگریز جنرل پینی میدان جنگ میں مارا گیا۔ یہاں کی پسپائی کے بعد آپ بریلی چلے گئے جہاں خان بہادر خاں ولد ذوالفقار خاں ولد حافظ رحمت اللہ خاں روہیلہ انگریزوں سے برسرِ پیکار تھے۔ لکھنؤ میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کے ساتھ بھی آپ رہے اور انگریزوں سے جنگ کی۔ یہاں سے مولانا مدراسی کے ساتھ شاہجہاں پور (قصبہ محمدی) گئے اور جب مولانا مدراسی نے شاہ جہاں پور میں اپنی حکومت قائم کی تو ان کی

وزارت میں شامل ہوئے۔

پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں کہ: "احمد اللہ شاہ صاحب کی شہادت کے بعد سرکردہ مجاہدین منتشر ہو گئے۔ کانپور، فرخ آباد، مراد آباد، بدایوں، بریلی اور شاہجہاں پور وغیرہ پر مکمل طور پر انگریز کا قبضہ ہو چکا تھا۔ مخبروں کی بن آئی تھی۔۔۔۔۔۔۔ فیروز شاہ شہزادہ اور ڈاکٹر وزیر خاں مکہ معظمہ پہنچے۔ مولانا فیض احمد کے متعلق مشہور ہے کہ نیپال کی طرف چلے گئے۔" (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد: مولانا فیض احمد بدایونی، ص ۵۳)

بعد کے حالات کا کچھ علم نہیں کہ آپ پر کیا گذری، کہاں اور کس طرح آپ کا انتقال ہوا؟ آپ کے ماموں مولانا فضل رسول بدایونی نے آپ کی تلاش میں قسطنطنیہ تک سفر کیا مگر کہیں سراغ نہ لگ سکا۔ اس طرح مولانا فیض احمد بدایونی نے دینی اور سیاسی محاذ پر مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں
مولانا سید کفایت علی کافیؔ کا مجاہدانہ کردار

مجاہد آزادی مولانا سید کفایت علی کافیؔ مراد آبادی (شہادت ۲۲ر رمضان ۱۲۷۴ھ/ ۶ر مئی ۱۸۵۸ء) عالم و فاضل اور بہترین طبیب و شاعر تھے۔ شاہ ابوسعید مجددی رامپوری سے آپ نے درس حدیث لیا اور مشہور شاعر ذکیؔ مراد آبادی (شاگرد امام بخش ناسخؔ) سے فن شاعری سیکھا۔ ۱۸۴۱ء میں حج و زیارت کی سعادت حاصل کی جس کی یادگار "تجمل دربار رحمت" ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی کئی تصانیف ہیں۔ مثلاً: ترجمہ شمائل ترمذی (منظوم)، مجموعۂ چہل حدیث (منظوم) مع تشریح، خیابان فردوس، بہار خلد، نسیم جنت، مولود بہار، جذبۂ عشق اور دیوان کافیؔ۔ آپ کی نعتیہ شاعری اور جذبۂ عشق رسول کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت امام احمد رضاؔ قادری برکاتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ؎

مہکا ہے مری بوئے دہن سے عالم
یاں نغمۂ شیریں نہیں تلخی سے بہم

کافیؔ "سلطانِ نعت گویاں" ہیں رضاؔ
ان شآء اللہ میں وزیراعظم

مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی انقلاب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف سینہ سپر تھے اور مرادآباد میں چلنے والی تحریک حریت کے قائدین میں پیش پیش تھے۔ نواب مجدالدین خاں عرف مجو خاں کی سرکردگی میں جب مرادآباد میں آزاد حکومت قائم ہوئی تو آپ کو مرادآباد کا صدرالشریعہ بنایا گیا اور آپ شرعی احکام کے مطابق مقدمات کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ مرادآباد میں مولانا کافیؔ نے انگریزوں کے خلاف فتوائے جہاد جاری کیا اور اس کی نقلیں دوسرے مقامات پر بھجوائیں اور بعض جگہوں پر آپ خود تشریف لے گئے۔ آنولہ کی تحریک آزادی میں بھی آپ نے حصہ لیا۔ آنولہ سے آپ بریلی پہنچے اور نواب خان بہادر خاں روہیلہ اور مولوی سرفراز علی سے مشورہ وتبادلۂ خیال کیا۔ پھر بریلی سے دہلی کے لیے جانے والی وہ فوج جو جنرل بخت خاں روہیلہ کی ماتحتی میں برسرِ پیکار تھی اس کے ساتھ آپ مرادآباد واپس آئے۔ انگریز مرادآباد کے ہنگامہ سے ڈر کر میرٹھ اور نینی تال فرار ہوگئے۔ حالات کے پیش نظر علمائے اسلام نے فوری انتظامات کے لیے ایک جنگی مشورتی کمیٹی قائم کی جو شہر کا انتظام بھی کرے گی اور جنگ کے لیے ذرائع ووسائل بھی فراہم کرے گی۔ مولانا کافیؔ اس کمیٹی کے اہم رکن تھے۔ ایک غیر منظم جہاد کو ناکام بنانے کے لیے نواب رامپور اور کچھ مقامی غداروں کا بہت بڑا ہاتھ رہا۔

رئیس القلم علامہ یاسین اختر مصباحی صاحب مرادآباد کی جنگ آزادی کی ناکامی کے دو اسباب تحریر فرماتے ہیں: اول یہ کہ کوئی مرکزی تنظیم نہیں تھی جو جنگ پر قابو پاتی۔ دوسرے جنگ کو ناکام بنانے کے لیے مقامی غدار بھی بہت ہی کوشاں تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر مجاہدین کو زبردست جانی ومالی نقصان اٹھانا پڑا۔ ان غداروں کی مدد سے انگریز دوبارہ ۲۴ر اپریل ۱۸۵۸ء کو شہر مرادآباد اور اس کے مضافات پر قابض ہوگئے، انگریزوں نے بے دردی کے ساتھ نواب مجو خاں کو بے حد اذیت ناک طریقے پر شہید کردیا اور پھر عیسائی تہذیب کا وہ ننگا ناچ شروع ہوا جس کو تاریخ عالم کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ اس وقت

انگریزوں نے غداروں کو ایک اور لالچ دے رکھا تھا کہ جو شخص کسی بھی مجاہد کو گرفتار کرائے گا اور پھانسی دلوائے گا اس کی جائیداد کا بڑا حصہ اس غدار کو دیا جائے گا۔ اس لالچ کا یہ نتیجہ نکلا کہ کوئی مجاہد ایسا نہیں بچا جس کو غداروں نے گرفتار کروا کے پھانسی نہ دلوادی ہو۔ جتنے بھی ساہوصاحبان ہیں یہ اسی غداری کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا مولانا کافی کی بھی مخبری ایک کمینہ صفت انسان فخر الدین کلال نے اس شرط پر کردی کہ گرفتاری کے بعد انعام میں مولانا کی تمام جائیداداس کو دے دی جائے۔

۳۰ راپریل کو مولانا صاحب کی گرفتاری کے بعد فوری کاروائی مقدمہ شروع ہوا۔ انگریزی کورٹ کا یہ عالم تھا کہ کسی بھی ملزم کے بیان کو جس طرح چاہے تحریر کردے۔ ملزم کو بیان دیکھنے یا وکیل کرنے کا حق نہیں تھا اور نہ کوئی صفائی پیش کرنے کی اجازت تھی۔ اس وقت انگریزوں نے ایک کمیشن قائم کیا تھا جو مقدمات کی سرسری سماعت کرکے سزا سنایا کرتا تھا۔ ۴رمئی ۱۸۵۸ء کو مولانا کافی کا مقدمہ ظالم وجابر انگریز مجسٹریٹ کے روبرو پیش ہوا اور بہت جلد اس کا فیصلہ سنا دیا گیا ۔(اخبارالصنادید،بحوالہ: چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء،ص ۹۶)

مولانا عبدالمالک مصباحی لکھتے ہیں: ''جسم نازنین پر گرم گرم استری پھیری گئی، زخموں پر نمک چھڑکا گیا، اسلام سے برگشتہ کرنے کیلئے انگریزوں نے ہر حربہ استعمال کیا مگر ناکام رہے۔ آخرکار مرادآباد کے ایک چوک میں برسرعام آپ کو تختہ پر لٹکا دیا گیا۔'' (خطبات اسلام،ص ۲۳۰)

مقدمہ کی پوری کاروائی صرف دودن میں پوری کردی گئی۔ ۴رمئی کو مقدمہ پیش ہوا اور ۶رتاریخ کو حکم لگادیا گیا اور اسی وقت پھانسی لگادی گئی۔(مرادآباد: تاریخ جدوجہد آزادی، بحوالہ: چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء،ص ۹۷) جس وقت مولانا کافی کو قتل گاہ لے جایا جا رہا تھا اس وقت آپ اپنی ایک نعت شریف پڑھتے ہوئے خراماں خراماں تشریف لے گئے ؎

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دین حسن رہ جائے گا
ہم صفیرو! باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا

بلبلیں اُڑ جائیں گی سُونا چمن رہ جائے گا
اطلس و کم خواب کی پوشاک پہ نازاں نہ ہو
اس تنِ بے جان پہ خاکی کفن رہ جائے گا
نامِ شاہانِ جہاں مٹ جائیں گے لیکن یہا
حشر تک نام و نشانِ پنجتن رہ جائے گا
جو پڑھے گا صاحبِ لَولاک کے اوپر دُرود
آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائے گا
سب فنا ہو جائیں گے کافیؔ ولیکن حشر تک
نعتِ حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

(۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا۔ از: امداد صابری، مرجع سابق ۹۴۔۹۵)

حضرت مولانا کافیؔ شہید کو مرادآباد جیل کے سامنے مجمع عام کے روبرو پھانسی دی گئی اور وہیں دفن کر دیا گیا۔ جناب مولوی سید ظفر الدین احمد مرحوم ابن حضرت حاجی مولوی سید نعیم الدین مرادآبادی بیان کرتے ہیں کہ ایک سڑک اس مقام سے نکالی جا رہی تھی اور مولانا کافیؔ شہید کے مزار کا نشان نمایاں نہیں تھا۔ مزدور کام کر رہے تھے کہ مولانا کی قبر کھل گئی اور مزدور کا پھاوڑا مولانا کافی شہید کی پنڈلی پر لگا۔ جسم اطہر ویسا ہی تھا جیسا شہادت کے وقت تھا۔ (۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا، مرجع سابق ۹۸) انجینئر نے سڑک کا رخ تبدیل کر دیا جس کی وجہ سے سڑک میں کچھ ٹیڑھا پن پایا جاتا ہے۔ جسم کہیں منتقل نہیں کیا گیا۔

دلاور جنگ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی: جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے سالار اعظم

دلاور جنگ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی (متولد ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۷ء۔ شہید ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) دریائے شور کے ساحلی علاقہ چنیا پٹن تعلقہ پورنا ملی جنوبی ہند کے نواب محمد علی مشیر و مصاحب سلطان ٹیپو کے فرزند تھے۔ آپ کا تعلق گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان سے تھا۔ آپ انقلاب ۱۸۵۷ء کے سالار اعظم تھے۔ آپ کی شجاعت و مردانگی تاریخ ہند اور تاریخ

انقلاب کے روشن ابواب ہیں۔ احمد علی نام، ضیاء الدین لقب اور دلاور جنگ خطاب ہے۔ اپنے عقیدت مندوں اور مریدوں کے ساتھ جب مولانا مدراسی کہیں نکلتے تو ایک دستہ نقارہ اور ڈنکا پیٹتا ہوا ساتھ ساتھ چلتا تھا اسی لیے آپ کو ''ڈنکا شاہ'' اور ''نقارہ شاہ'' بھی کہا جاتا تھا۔ عہد شباب ہی میں آپ پر فقر و تصوف کا غلبہ ہوا اور ریاضت و مجاہدہ کے لیے گھر بار چھوڑ کر حیدر آباد دکن اور مدراس وغیرہ ہوتے ہوئے انگلستان پہنچ گئے، وہاں سے مصر گئے اور پھر حجاز پہنچ کر حج و زیارت کے بعد ترکی، ایران اور افغانستان ہوتے ہوئے ہندوستان واپس آئے۔ بیکانیر و سانبھر میں بارہ سال تک ریاضت و مجاہدہ اور چلہ کشی کی۔ پھر جے پور آ کر میر قربان علی شاہ چشتی کے مرید ہوئے اور خلافت سے سرفراز کیے گئے۔ یہاں سے ٹونک گئے اور پھر گوالیار میں محراب شاہ قلندر گوالیاری کی خدمت میں پہنچے اور اس حکم کے ساتھ آپ کو محراب شاہ نے اجازت و خلافت دی کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے ہر حال میں آزاد کرانا ہے۔ حضرت قربان علی شاہ چشتی جے پوری اور حضرت محراب شاہ قلندر قادری گوالیاری سے چشتی و قادری خلافت پا کر آپ چشتیت و قادریت کا سنگم بن گئے۔ چنانچہ اپنے مرشد کے وعدے کی تکمیل کے ارادہ سے آپ تقریباً ۱۸۴۶ء میں گوالیار پہنچے۔ دہلی کے مشاہیر علما و مشائخ سے آپ نے ملاقات و گفتگو کی۔ مفتی صدر الدین آزردہؔ نے مشورہ دیا کہ اس مہم کے لیے ماحول سازی آگرہ کے اندر بہتر اور مؤثر طریقے سے ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی مفتی آزردہؔ صاحب نے مفتی انعام اللہ خان بہادر (سرکاری وکیل آگرہ، ساکن گوپامئو ضلع ہردوئی) کے نام ایک سفارشی خط بھی لکھا۔ آگرہ پہنچ کر آپ نے دینی و علمی شخصیات اور سربرآوردہ حضرات سے رابطہ قائم کیا۔ آپ کا اثر روز بروز بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ ''مجلس علما آگرہ'' قائم کر کے آگرہ کے علما کو آپ نے مربوط و منظم کیا، اس طرح علما آپ کے دست و بازو بن گئے۔ مولانا صاحب نے اپنے اثر و رسوخ سے دیسی فوج کی تمام رجمنٹوں میں کمیٹیاں بنا دی تھیں، قاصد تیار کئے اور سپاہیوں کی آدھی رہائش گاہوں پر آدھی رات کو خفیہ کانفرنسیں کرواتے۔ میلسن اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ نئے کارتوسوں کے بارے میں دیسی سپاہیوں کو معلومات مولانا مدراسی نے ہی دی۔ (چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء، ص ۱۰۴)

آپ کے وعظ و بیان میں ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا۔ جگہ جگہ آپ کے تبلیغی و اصلاحی دورے ہوتے تھے۔ آپ کی شہرت اور آپ کے تعلقات و اثرات کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا۔ بڑے بڑے علما و فضلا و ادبا و شعرا آپ کے گرویدہ ہو گئے۔ آپ کے عزائم اور آپ کی ہر دل عزیزی نے حکومتِ وقت کو چوکنا کر دیا اور انگریز مخالف سرگرمیوں نے سرکاری کارندوں کے ہوش اڑا دیئے۔ مولانا امیر علی شاہ (امیٹھی، لکھنؤ) کی شہادت پر لکھنؤ آئے، فیض آباد گئے۔ حکومت نے آپ کو نظر بند کر دیا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء رونما ہوا تو جیل ٹوٹی تو آپ رہا ہو کر مع محبان وطن کے لکھنؤ آئے اور نصف لکھنؤ پر قبضہ کر لیا اور اپنا اقتدار بڑھانا شروع کیا۔ مموخاں نے شہزادہ برجیس قدر کو تخت پر بٹھایا اور بہادر شاہ ظفر کے نائب کا اعلان کیا۔ نگراں ملکہ اودھ حضرت محل تجویز ہوئیں۔ کمپنی اور حضرت محل کے کئی محاذ پر بڑے بڑے مقابلے ہوئے۔

دلاور جنگ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی نے دہلی و آگرہ کے بعد میرٹھ، پٹنہ، کلکتہ وغیرہ کے بھی دورے کئے اور انگریزوں کے خلاف مہم کا دائرہ کافی وسیع کر لیا۔ ''تحریک ۱۸۵۷ء کے لیے پورے ملک کو تیار کرنے میں مولانا شاہ احمد اللہ کا نام سرفہرست آتا ہے۔ وہ ملک کے گوشے گوشے میں دورے کر کے بغاوت کے لیے عوام کو آمادہ کر رہے تھے۔ لکھنؤ، فیض آباد، شاہجہاں پور میں مولانا مدراسی نے انگریزوں سے گھمسان کی جنگ لڑی۔ آخر میں قصبہ محمدی (شاہجہاں پور) میں مولانا مدراسی، شہزادہ فیروز شاہ، جنرل بخت خاں، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی وغیرہ نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ شاہزادہ فیروز شاہ وزیر مقرر ہوئے اور جنرل بخت خاں کمانڈر۔ خلافت راشدہ کی اتباع میں حکومت شرعیہ کا نقشہ قائم ہوا اور سکہ مولانا مدراسی کے نام کا جاری ہوا۔'' (چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء، ص ۱۰۷)

مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی اپنی کتاب ''ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما'' میں لکھتے ہیں کہ: ''مولوی احمد اللہ شاہ ہفتے میں تیسرے دن بعد نماز عصر قلعہ اکبر آباد کے میدان میں مردوں کو لے جا کر فن سپاہ گری اور شہ سواری کی مشق کرایا کرتے۔ خود بھی ایسا نشانہ لگاتے

جس کا جواب نہ تھا۔تلوار کے ہاتھ ایسے بچے تلے ہوتے جس کی دھوم تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جامع مسجد میں آپ کے زمانے میں جتنے آدمی جمع ہو گئے اتنے دیکھنے میں نہیں آئے۔''(مرجع سابق،ص ۱۰۷)

مولانا مدراسی پوائیں (شاہجہاں پور) پہنچے،راجہ بلایو سنگھ نے غداری کی،راجہ بلدیو سنگھ نے آپ کا سرمبارک ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء کوتن سے جدا کر کے آپ کو شہید کر دیا، بلدیو سنگھ کو انگریزوں نے پچاس ہزار روپئے کا انعام دیا۔سرمبارک عرصہ تک شاہجہاں پور کوتوالی میں لٹکا رہا اور جسم کو آگ میں پھونک دیا گیا۔مولانا مدراسی کی شہادت کے ساتھ ہی انقلاب ۱۸۵۷ء کا یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

پروفیسر محمد ایوب قادری ''جنگ آزادی ۱۸۵۷''مطبوعہ کراچی میں لکھتے ہیں کہ: شاہ احمد اللہ صاحب کی شہادت پر روہیل کھنڈ کی ہی جنگ آزادی نہیں بلکہ درحقیقت ہندوستان کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ختم ہو گئی۔ (مرجع سابق ۱۱۳)مولانا مدراسی کی شہادت کے بعد انگریزوں کا عام تاثر یہ تھا کہ شمالی ہند میں ہمارا سب سے بڑا دشمن اور سب سے خطرناک انقلابی ختم ہو گیا۔

انگریز مؤرخ جی ڈبلیو فارسٹر لکھتا ہے:''یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ عالم باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھا،روحانی طاقت کی وجہ سے صوفی تھا،جنگی مہارت کی وجہ سے سپاہی اور سپہ سالار تھا۔۔۔۔۔ظلم طبیعت میں نہ تھا،ہر انگریز اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔''(ہسٹری ڈی انڈین میوٹنی،بحوالہ:مرجع سابق،ص ۱۱۳۔ ۱۱۴)

انگریزوں نے برملا اس بات کا بھی اعتراف کیا کہ: باغیوں میں وہ ہی بادشاہت کے لیے سب سے زیادہ مستحق تھا۔(مرجع سابق،ص ۱۱۵)اس طرح شاہ صاحب کا بارہ سالہ جہاد کا سفر اختتام پذیر ہوا۔

غریق بحر رحمت مفتی عنایت احمد کاکوروی (متولد ۱۲۲۸ھ/ ۱۸۱۳ـ متوفی ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء) دیوہ (بارہ بنکی، اودھ) میں پیدا ہوئے اور اپنی نانیہال کاکوری (لکھنؤ) میں اپنے والد منشی محمد بخش کے ساتھ مستقل رہائش پذیر ہوئے۔ دیوہ اور کاکوری میں ابتدائی تعلیم کے بعد رام پور پہنچ کر مختلف علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی میں شاہ محمد اسحق اور علی گڑھ میں مولانا بزرگ علی مارہروی سے درس حدیث اور دیگر علوم پڑھ کر علی گڑھ میں مدرس اور مفتی کے منصب پر فائز ہوئے۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی نے سرکاری ملازمت بھی کی۔ پہلے علی گڑھ میں منصف ہوئے۔ کچھ عرصہ پھپھوند (اٹاوہ) میں بھی منصف رہے، پھر صدر امین بن کر بریلی گئے۔ وہاں آپ زیادہ دنوں تک رہے اور کئی ایک دینی وعلمی کتابیں بھی لکھیں۔ یہاں آپ نے ایک اصلاحی اور تبلیغی انجمن ''جلسۂ تائید دینِ متین'' قائم کر کے لٹریچر کی نشرواشاعت کی۔ اس انجمن کو برصغیر کی پہلی اصلاحی انجمن کہا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے شروع میں آپ کو صدرالصدور آگرہ بنایا گیا۔ ابھی سفر کی تیاری جاری تھی کہ ماہ مئی میں انقلاب برپا ہوگیا اور آپ آگرہ نہ جا کر بریلی ورام پور میں انقلابیوں کے ہمنوا ومعاون بلکہ سرپرست کی حیثیت سے سرگرم ہوگئے۔

مجاہدین کے لیے مالی تعاون اور انگریزوں کے خلاف جہاد پر مشتمل ایک فتویٰ بریلی سے جاری ہوا جس پر مفتی عنایت احمد کاکوروی کے دستخط تھے۔ ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء'' میں پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں: ''انقلاب سے پہلے بریلی میں اس تحریک کے دو ممتاز کارکن موجود تھے۔ مولوی سرفراز علی اور دوسرے مفتی عنایت احمد کاکوروی۔'' (مرجع سابق، ص ۱۱۸)

میاں عبدالرشید کالم نگار روزنامہ نوائے وقت لاہور لکھتے ہیں: ''آپ (مفتی عنایت

احمد) بریلی میں نواب خان بہادر خاں روہیلہ کی قیادت میں جہاد حریت کی تنظیم کے لیے سرگرم عمل رہے۔ان دنوں روہیل کھنڈ بریلی مجاہدین آزادی کا اہم مرکز تھا۔مولانا احمد رضا خاں کے دادا مولانا رضا علی خاں بریلوی اس تحریک کے قائدین میں سے تھے۔مفتی عنایت احمد کاکوروی نے مجاہدین کی تنظیم پر اکتفانہ کیا بلکہ نواب خان بہادر خاں روہیلہ کے دست و بازو کی حیثیت سے مختلف معرکوں میں عملی حصہ بھی لیا۔'' (جنگ آزادی نمبر، ماہنامہ ترجمان اہلسنّت کراچی، جولائی ۱۹۷۵ء)

انقلاب کی چنگاری بجھنے کے بعد جب علما و قائدین انقلاب کی دارو گیر کا سلسلہ شروع ہوا تو مجاہدین کے لیے مالی امداد و تعاون پر مشتمل فتویٰ اور انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں مفتی صاحب کے خلاف انگریزوں نے مقدمہ چلایا اور اس وقت کے عام دستور کے مطابق کچھ رسمی نمائشی عدالتی کاروائی کر کے آپ کو حبسِ دوام در جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) کی سزا دی گئی۔جہاں آپ نے چار سال تک کسی طرح اپنے ایام اسیری کی مشقتیں جھیلیں۔ایک انگریز نے ''تقویم البلدان'' کے ترجمہ کی خواہش ظاہر کی جسے آپ نے قبول فرمایا اور دو سال کی مدت میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔یہی علمی کام آپ کی رہائی کا سبب بن گیا اور ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء میں آپ جزیرۂ انڈمان سے رہا ہو کر ہندوستان واپس آئے۔

جزیرۂ انڈمان میں مفتی عنایت احمد کوروی و علامہ فضل حق خیرآبادی کی تاریخی و علمی خدمات کے بارے میں مولانا عبدالشاہد شیروانی لکھتے ہیں: ''علامہ (فضل حق) جزیرۂ انڈمان پہنچے۔مفتی عنایت احمد کاکوروی صدر امین بریلی و کول، مفتی مظہر کریم دریابادی اور دوسرے مجاہدین علما وہاں پہنچ چکے تھے۔ان علما کی برکت سے یہ جزیرہ دارالعلوم بن گیا تھا۔ان حضرات نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ وہاں بھی قائم رکھا۔خرابیِ آب و ہوا، تکالیف شاقہ وجدائیِ احباب و اعزہ کے باوجود علمی مشاغل جاری رہے۔'' (باغی ہندوستان، ص ۲۲۵)

کالا پانی میں مفتی صاحب نے سیرت النبی پر ایک مختصر کتاب ''تواریخ حبیب الٰہ'' اور فن صرف کی کتاب ''علم الصیغہ'' تحریر کی جو آج بھی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ان

کے علاوہ بھی آپ کی لکھی ہوئی لگ بھگ دو درجن کتابیں ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے مراجعت کتب کے بغیر محض اپنے حافظہ کی مدد سے "تواریخ حبیب الٰہ" (اردو) اور "علم الصیغہ" (فارسی) لکھی۔ ہندوستان واپسی کے بعد جب ان دونوں کتابوں کا مواد اصل مراجع و مآخذ سے ملایا تو بالکل درست پایا۔ ان حضرات کے سینے علم کے ایسے سفینے بن گئے تھے کہ تاریخی یادداشت، ترتیب واقعات، قواعد فنون، ضوابط علوم وغیرہ سبھی حیرت انگیز کرشمے دکھا رہے تھے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی نے بھی ایام اسیری میں "الثورۃ الہندیہ" اور "قصائد فتنۃ الہند" تحریر کیا تھا جو مفتی عنایت احمد کاکوروی کے ذریعہ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں اپنے فرزند مولانا عبدالحق خیرآبادی کے پاس بھیجا تھا جو پنسل اور کوئلے سے لکھے ہوئے مختلف پرچے تھے۔ جن کو کئی ماہ کی محنت کے بعد درست اور مرتب کیا گیا۔ اس کتاب پر مولانا ابوالکلام آزاد نے تعارف لکھا اور مولانا محمد عبدالشاہد خاں شیروانی نے ۱۹۴۶ء کو ترجمہ کر کے شائع کیا۔ جدید ایڈیشن اضافات کے ساتھ المجمع الاسلامی مبارک پور نے "باغی ہندوستان" کے نام سے شائع کیا۔

۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء میں جزیرۂ انڈمان سے رہائی کے بعد مفتی صاحب نے کان پور کو اپنی دینی و علمی آماج گاہ بنایا اور مدرسہ فیض عام قائم کر کے درس وتدریس میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ اپنے مدرسہ فیض عام کانپور کی کچھ خدمت کر کے آپ حج وزیارتِ حرمین شریفین کی نیت سے حجاز مقدس کے سفر پر روانہ ہوئے۔ آپ کو امیرالحجاج بنایا گیا اور شوق ووارفتگی کے ساتھ سارا قافلۂ حجاج بحری جہاز سے سرزمین حجاز کی جانب روانہ ہوا۔ اثنائے سفر ایک سخت چٹان سے آپ کا جہاز ٹکرایا اور شدت ضرب سے پاش پاش ہوگیا۔ باون سال کی عمر میں ۱۷ رشوال ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء میں آپ مع قافلۂ حجاج شہید اور غریق رحمت ہوگئے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی: ردّ نصرانیت کے ماہر

پایۂ حرمین مولانا رحمت اللہ کیرانوی (متولد ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء۔متوفی ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۱ء) کبیر الاولیا مخدوم جلال الدین پانی پتی (متوفی ۷۶۵ھ) کی اولاد میں سے ایک بلند پایہ عالم دین ہیں۔جن کا سلسلہ نسب خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ردِ نصرانیت کے باب میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا نام ہندوستان میں معروف اور سرفہرست ہے۔اپنی پوری زندگی میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے سب سے نمایاں کام یہی کیا ہے۔آپ کی دوسری عظیم الشان دینی و علمی خدمت ''مدرسہ صولتیہ مکۂ مکرمہ'' کی تاسیس ہے اور تیسرے مرحلے میں انگریزوں کے خلاف آپ کی جدوجہد اور انقلاب ۱۸۵۷ء میں آپ کا مخلصانہ کردار اور زمین وجائداد کی قربانی ہے۔کیرانہ مظفر نگر (موجودہ مغربی یوپی) میں ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ حیات دہلی میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔پھر لکھنؤ جاکر مفتی سعد اللہ مرادآبادی (متوفی ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء۔شاگرد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی و مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی) سے چند اعلیٰ کتابوں کا درس لیا۔شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی (متوفی ۱۲۹۶ھ/ دسمبر ۱۸۷۸ء) سے حدیث نبوی سے کئی کتابیں پڑھیں۔مولانا امام بخش صہبائی سے بھی کچھ تحصیل علم کیا۔شروع میں کئی سال تک کیرانہ کی مسجد میں طلبہ کو پڑھایا۔مشنری اسکولوں اور پادریوں کی سرگرمیاں جب زیادہ بڑھنے لگیں اور انھوں نے اسلام پر اعتراضات کیے تو شاہ عبدالغنی مجددی کے حکم پر ''ازالۃ الاوھام'' کے نام سے آپ نے ایک ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں عیسائیوں بالخصوص پادری فنڈر کی لکھی ہوئی کتاب ''میزان الحق'' کے سارے اعتراضات کا اطمینان بخش جواب دیا۔

۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر کے درمیان آگرہ میں ایک تاریخی مناظرہ ہوا جس میں پادری فنڈر کو آپ نے لاجواب کر دیا۔اس مناظرہ کی تفصیلات اسی وقت کتابوں میں شائع ہوگئیں۔اس مناظرہ میں مولانا فیض احمد بدایونی اور

مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی آپ کے خصوصی معاون تھے۔انقلاب ۱۸۵۷ء شروع ہوا تو آپ نے انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کی۔مولانا امداد صابری دہلوی لکھتے ہیں ''اس زمانہ میں عصر کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم وتربیت کے لیے کیرانہ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ کی آواز پر لوگوں کو جمع کیا تھا اور اعلان ہوتا تھا کہ ''ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا'' (آثار رحمت،بحوالہ: ۱۸۵۷ء: پس منظر و پیش منظر،ص ۲۹۶)

مولانا کیرانوی کا دہلی کے علمی طبقے اور لال قلعہ کے شہزادوں پر اثر اور ان سے تعلقات تھے اس لیے اس وقت بہادر شاہ ظفر اور دوسرے مجاہدین کے ساتھ مولانا رحمت اللہ صاحب نے بھی جنگ آزادی کا نقشہ بنانے میں حصہ لیا اور جنگ میں شرکت فرمائی۔ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی اور مولانا فیض احمد بدایونی کے ساتھ دہلی کی جنگ آزادی میں شریک ہوئے۔

کتاب آثار رحمت،تاریخ عروج عہد انگلشیہ اور روزنامچہ عبداللطیف کے علاوہ دیگر کتابوں میں مولانا کیرانوی کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا ذکر ملتا ہے۔ان مجاہدانہ سرگرمیوں کے سبب انگریزوں نے آپ کے خلاف مقدمہ چلایا اور اعلان کیا کہ مولانا کیرانوی کو گرفتار کر کے انھیں انگریزوں کے حوالے کرنے والے شخص کو ایک ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا ۔مگر آپ گرفتار نہ کیے جاسکے اور کسی طرح آپ مکۂ مکرمہ پہنچ گئے۔کیرانہ میں آپ کی جائداد و ملکیت ضبط کر کے نیلام کردی گئی۔اسی طرح پانی پت کی آپ کی موروثی جائداد بھی نیلام کردی گئی۔مکہ مکرمہ پہنچ کر آپ نے ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء میں مدرسہ صولتیہ قائم کیا اور درس وتدریس میں مصروف ہوگئے۔حاجی امداداللہ مہاجر مکی اور شیخ زینی دحلان شافعی مکی نے وہاں آپ کو کافی سہارا دیا۔سلطان ترکی کی دعوت پر کئی بار آپ نے قسطنطنیہ کا سفر کیا۔انھیں کی خواہش پر آپ نے ردِ نصرانیت میں اپنی معرکۃ الآرا کتاب ''اظہار الحق'' مکہ مکرمہ میں لکھ کر پادریوں کا ناطقہ بند کردیا۔ ۲۴ ؍رمضان ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۱ء میں مکہ مکرمہ میں آپ کا انتقال ہوا اور جنت المعلیٰ میں آپ کی تدفین ہوئی۔

مولانا ڈاکٹر وزیر علی خاں اکبرآبادی: حریت نواز

مولانا ڈاکٹر وزیر علی خاں اکبرآبادی (متوفی ۱۱۸۹ھ/ ۱۸۷۳ء) بہار کے رہنے والے تھے۔ والد محمد نذیر خاں نے ابتدائی تعلیم کے بعد مرشدآباد (بنگال) میں انگریزی تعلیم دلائی اور پھر انگلینڈ بھیج دیا جہاں محنت سے آپ نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی، ساتھ ہی یونانی و عبرانی زبانیں سیکھیں اور انجیل و توریت وغیرہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ ہندوستان واپسی کے بعد کلکتہ کے ایک اسپتال میں حکومت کی طرف سے اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوئے، اس کے بعد آگرہ آئے۔ یہاں اپنے کام کے ساتھ مفتی انعام اللہ گوپامئوی وکیل صدر سے ربط وضبط ہوا۔ اور جب مولانا احمد اللہ مدراسی نے مجلس علما آگرہ بنا کر اپنی سرگرمی شروع کی تو آپ ان کے دست و بازو بن گئے۔

''غدر کے چند علما'' میں مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی لکھتے ہیں کہ: ''ڈاکٹر وزیر خاں کو انگریز دشمنی اور حریت نوازی کا چسکا شاہ صاحب (احمد اللہ مدراسی) کے فیض صحبت سے پڑا۔۔۔ ۱۸۵۴ء میں پادری فنڈر سے آگرہ میں تین دن تک مناظرہ ہوا جس میں آپ نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے معاون تھے۔'' (چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء، ص ۱۴۲۔۱۴۵) مزید لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر وزیر خاں مردانہ وار نکل آئے۔ آگرہ میں جو فوج فدائیوں کی آئی اس کی سرپرستی ڈاکٹر صاحب نے کی۔ انگریز قلعہ بند ہو گئے۔ یہ مولوی فیض احمد بدایونی کو لے کر دہلی پہنچے۔ بہادر شاہ کا دربار جما ہوا تھا۔ بریلی سے جنرل بخت خاں آ چکے تھے۔ ''وار کونسل'' بنی ہوئی تھی۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس میں داخل کر لیے گئے۔ جنرل بخت خاں لارڈ گورنر تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ہمراہ لیا۔ مولوی فیض احمد مرزا مغل کے پیش کار مقرر ہوئے۔ جنرل صاحب نے انگریزی فوج کو جہاں مقابلہ ہوا شکست دی۔ مرزا مغل ایک معرکہ میں منہ کی کھا آئے۔ ادھر مرزا الٰہی بخش نے مرزا مغل کو گانٹھ لیا تھا اور خوف زدہ کر دیا تھا کہ جنرل روہیلہ ہے۔ نواب غلام قادر خاں روہیلہ کے خاندان سے ہے۔ بہادر شاہ اور تمہارے پردے میں انگریزوں کو نکال کر خود تخت نشین ہونا چاہتا ہے۔ مرزا مغل کان کے کچے، دوست دشمن کو نہ پہنچان سکے۔ جنرل بخت خاں نے ایک مورچہ خود سنبھالا۔ دوسرا مورچہ کشمیری گیٹ کا مرزا مغل کے

سپرد کیا۔ مرزا نے وقت پر ہمت ہار دی، جیتی ہوئی بازی ہاتھ سے جاتی رہی۔ جنرل بخت خاں نے یہ رنگ دیکھ کر ڈاکٹر وزیر خاں سے کہا! اپنی فوج کو علاحدہ کرلو اور اپنے ہمنوا جو ہو اس کو ساتھ لو، یہ مغل بچے انگریز سے ساز باز کر گئے۔ نتیجہ یہ نظر آتا ہے کہ ہم سب یہیں کھیت ہو کے رہ جائیں گے۔ مقبرہ ہمایوں جا کر بادشاہ کی خدمت میں جنرل بخت خاں باریاب ہوا اور سب حال عرض کیا اور کہا کہ آپ میرے ساتھ چلیے۔ مگر نواب زینت محل نے بادشاہ کو اس کی ہمراہی کے لیے آمادہ نہ ہونے دیا۔ آخرش! جنرل صاحب دلّی سے روانہ ہوگئے۔ ان کے جاتے ہی مقبرۂ ہمایوں میں بہادر شاہ گرفتار کر لیے گئے۔" (چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء، ص ۱۴۶)

دہلی میں پسپائی کے بعد جنرل بخت خاں روہیلہ ،ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی اور مولانا فیض احمد بدایونی وغیرہ اپنی فوج کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف مورچہ بندی کی۔ پھر سب کو لکھنؤ چھوڑ کر شاہجہاں پور جانا پڑا۔ وہاں بھی جب ناکامی ہوئی تو منتشر ہو کر اکثر حضرات نیپال چلے گئے۔ ڈاکٹر وزیر خاں مکۂ مکرمہ پہنچے اور مولانا کیرانوی کے ساتھ مکۂ مکرمہ ہی میں مقیم ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب مکۂ مکرمہ میں چودہ سال تک بقید حیات رہے۔ وہیں ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۳ء میں آپ کا انتقال ہوا اور جنت المعلیٰ میں تدفین ہوئی۔

مولانا وہاج الدین مرادآبادی: بے باک مجاہد

مولانا وہاج الدین عرف مولوی منو مرادآبادی (شہادت ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) خلف مولوی جمیل الدین بن مولوی وجیہ الدین بن مفتی شیر محمد شہر مرادآباد کے بڑے عالم اور رئیس تھے۔ شجاع و بلند اخلاق اور ہمدرد و غمگسار تھے۔ دینی جذبہ اور قوم پروری میں بے مثال تھے۔ حکام شہر آپ کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عوام وخواص میں آپ یکساں مقبول تھے۔ عربی و فارسی و اردو کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی آپ کو قدرت تھی۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں آپ نے مرادآباد میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹ رمئی ۱۸۵۷ء کو مرادآباد جیل خانہ پر آپ نے ایک ہجوم کے ساتھ حملہ کیا اور سارے قیدیوں کو آزاد کرا لیا۔ مسٹر جان کرافٹ

ولسن یہ خبر سنتے ہی روپوش ہو گیا تھا۔

مولانا وہاج الدین نے رام پور کا دورہ کر کے وہاں بھی جہاد اور حریت کی روح پھونکنے کا سرفروشانہ اقدام کیا کیوں کہ نواب رام پور یوسف علی خاں انگریزوں کے وفادار تھے۔ ریاست رام پور کی منجمد فضا میں حرکت پیدا کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ مگر فدائے قوم مولوی وہاج الدین کی یہ قوم پروری، حب الوطنی اور شجاعت تھی کہ سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ خطرات کی اس وادی میں کود پڑے۔ وہ بے خوف و خطر ہو کر رام پور خاص اور گردونواح کے قصبوں اور دیہاتوں میں جلسے کرتے، پمفلٹ پڑھ کر سناتے اور اس طرح اپنے سپوتوں کو بیدار کر کے جنگ آزادی کی تحریک میں شمولیت کی دعوت دیتے۔

مرزا ناظم بخت کے بیٹے اور فرخ سیر بادشاہ کے نواسے شہزادہ فیروز شاہ جب مراد آباد پہنچا تو آپ اس کے دست راست بن گئے۔ مولانا سید کفایت علی کافی اور مولانا وہاج الدین نے مل جل کر مراد آباد میں انقلاب برپا کر دیا۔ شہزادہ فیروز شاہ کی سرپرستی میں ان حضرات نے نواب کی فوج اور انگریزوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انقلاب کی ناکامی کے بعد ایک مخبر کی غداری سے مولانا وہاج الدین کے گھر پر رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں عصر و مغرب کے درمیان انگریزوں نے ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء میں ایک روز دھاوا بول دیا اور گھر کے اندر ہی گولی مار کر آپ کو شہید کر دیا۔

مولانا امام بخش صہبائی دہلوی: ایک مظلوم سپاہی

مولانا امام بخش صہبائی دہلوی (شہادت ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء) کا سال ولادت ۳۔۱۸۰۲ء کے آس پاس قرار دیا جاتا ہے۔ صہبائی کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور والدہ کی طرف سیدنا غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ امام بخش صہبائی کو "معمائی" بھی کہا جاتا تھا کہ انھیں فنِ معمہ میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ آپ مولانا عبداللہ خاں علوی کے شاگرد اور اردو زبان کے مشہور شاعر ہونے کے ساتھ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ آپ نے تین بادشاہوں شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی اور

بہادر شاہ ظفر کا زمانہ دیکھا۔ سرسید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) نے اپنی مشہور کتاب ''آثار الصنادید'' کی ترتیب میں صہبائی سے مدد لی تھی، جس کا انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے اور اپنی کتاب میں ان کا بڑا تفصیلی اور والہانہ ذکر بھی کیا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے لکھا ہے کہ صہبائی کی نظم و نثر اور دیگر رسائل اور شروح تین جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ (یادگار غالب، ص ۲۳)

بابائے اردو مولوی عبد الحق نے ذکر کیا ہے کہ ''ان کی کتابیں نصابِ تعلیم میں داخل تھیں۔ (مرحوم دہلی کالج، ص ۱۶۲)

غالبؔ نے جہاں اپنے معاصرین کا ذکر کیا ہے، وہاں صہبائی کو بھی یاد کیا ہے، کہتے ہیں ؎

مومن و نیر و صہبائی و علوی و انگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاہ

امام بخش صہبائی جلد ہی فارسی کے ایک قادر الکلام شاعر، صاحب طرز انشا پرداز، دقیقہ رس شارح اور نکتہ بیں محقق کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ فنونِ شعر اور علمِ عروض وقافیہ میں انھوں نے مہارت حاصل کر لی، یہی وجہ ہے کہ اس دور کے تمام تذکرہ نگار و ادبا نے ان کی اُستادی اور قادر الکلامی کا لوہا مانا ہے۔ مفتی صدر الدین آزردہؔ، مولانا فضل حق خیر آبادی، غالبؔ، شیفتہؔ اور دیگر اکابر اُن کی فارسی دانی کے بڑی حد تک قائل تھے۔ ۱۸۴۰ء میں لفٹننٹ گورنر دہلی نے مفتی صدر الدین آزردہؔ کی نشان دہی پر آپ کو دہلی کالج میں فارسی زبان کا استاذ مقرر کیا۔ مرزا غالبؔ اور صہبائی میں گہری دوستی تھی۔ مفتی آزردہؔ اور علامہ فضل حق خیر آبادی کے گھر تقریباً روزانہ ہی صہبائی جایا کرتے تھے جہاں علم وفضل اور شعر وادب کی محفلیں ہر وقت آراستہ رہا کرتی تھیں۔ مولانا صہبائی انگریز مخالف ذہن رکھنے کے ساتھ انقلابیوں اور مجاہدوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ اور قلعۂ معلّٰی کی مجلسوں اور بعض مشوروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے آپ کے محلہ کوچہ چیلان دہلی سے ایک بار چودہ سو آدمیوں کو گرفتار کر کے راج گھاٹ (نئی دہلی) جمنا کنارے گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ انھیں میں مولانا صہبائی بھی تھے۔ آپ کے گھر سے اکیس افراد شہید کیے گئے۔

مولانا صہبائی کے بھانجے مولانا قادر علی بیان کرتے ہیں: ''میں صبح کی نماز اپنے ماموں

مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہر پرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دَن دَن کرتے آ پہنچے۔ پہلی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔۔۔۔۔۔ پھانسیوں کی بجائے باغی گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے۔ مسلح سپاہیوں نے اپنی بندوقیں تیار کیں۔ ہم تیس چالیس آدمی ان کے سامنے کھڑے تھے کہ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا کہ موت تمہارے سر پر ہے گولیاں تمہارے سامنے ہیں اور دریا تمہاری پشت پر ہے۔ تم میں جو لوگ تیرنا جانتے ہیں وہ دریا میں کود پڑیں۔ میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی اور ان کے صاحبزادے مولانا سوزؔ تیرنا نہیں جانتے تھے۔ اس لیے دل نے گوارہ نہ کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں۔ لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا اس لیے میں دریا میں کود پڑا پچاس یا ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کانوں میں آئیں اور صف بستہ لوگ گر کر مر گئے۔" (۱۸۵۷ء پس منظر و پیش منظر، ص ۳۰۲)

راقم الدولہ ظہیر دہلوی اپنی کتاب "داستان غدر" میں لکھتے ہیں: "اس محلہ کے چودہ سو آدمی گرفتار کر کے راج گھاٹ کے دروازے کے دریا پر لے جائے گئے اور انھیں بندوقوں کی باڑھیں ماردی گئیں اور لاشیں دریا میں پھنکوادی گئیں۔ عورتوں کا یہ حال ہوا کہ گھروں میں سے نکل کر بچوں سمیت کنوؤں میں جا گریں۔ چیلوں کے کوچہ کے تمام کنویں لاشوں سے پٹ گئے تھے۔" (چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء، ص ۱۵۲)

اس المناک شہادت کی خبر سن کر حضرت مفتی آزردہؔ کا دل تڑپ اٹھا اور زبان بے اختیار پکار اٹھی کہ ؎

کیوں کر آزردہؔ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

اکبر الٰہ آبادی کہتے ہیں:

نوجوانوں کو ہوئیں پھانسیاں بے جرم و قصور
ماردیں گولیاں پایا جسے کچھ زور آور
وہی صہبائی جو تھے صاحب قول فیصل
ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر

مولانا رضا علی خاں بریلوی: حریت پسند

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی دادا مولانا رضا علی خاں بریلوی (متولد ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء متوفی جمادی الاولیٰ ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء) کا سلسلۂ نسب قندھار سے آ کر ہندوستان میں رہائش پذیر ہونے والے آباواجداد سے ملتا ہے۔ آپ کا سلسلۂ اجازت وخلافت اور سندِ حدیث مولانا خلیل الرحمن کے واسطہ سے بحر العلوم حضرت علامہ محمد عبدالعلی فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) تک متصل ہے۔ متحدہ ہندوستان میں رائج و مشہور ''خطبات علمی'' آپ ہی کے تحریر کردہ ہیں جو آپ کے ایک عزیز شاگرد مولانا محمد حسن علمی کے نام سے شائع ہو کر ہندوستان کے شہر شہر میں مقبول ہوئے۔ آپ نے جنگ آزادی میں قولاً فعلاً عملاً ہر طرح سے حصہ لیا اور شجاعت و بہادری کے انمٹ نقوش چھوڑے، اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ جنگ آزادی کے عظیم رہنما تھے۔ عمر بھر انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہے، آپ ایک بہترین جنگجو اور سپاہی تھے۔ لارڈ ہیسٹنگ آپ کے نام سے سخت ناراض تھا اور جنرل ہڈسن جیسے برطانوی جنرل نے تو آپ کے سر پر پانچ سو روپئے کا انعام رکھ دیا تھا یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ اپنے ناپاک منصوبہ میں عمر بھر ناکام رہے ؎

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

مولانا رضا علی خاں بریلوی حریت پسند تھے۔ انگریزی اقتدار کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ علمائے اہل سنّت نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تو مولانا رضا علی خاں بریلوی نے بھی فتوائے جہاد کی حمایت کی اور عوام کو انگریزی حکومت کا تختہ پلٹنے کے لیے مستعد فرمایا۔ مجاہدین کی ہر امکانی مدد کی۔ مولانا بریلوی مجاہدین کو گھوڑے مہیا کیا کرتے تھے تاکہ مجاہدین شب خون مار کر انگریزوں کو شکست دے سکیں۔ مولانا نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں عملاً حصہ لیا۔ شجاعت و بہادری آپ کو ورثہ میں ملی تھی۔ جنگ آزادی میں فرنگی اقتدار کا تختہ پلٹنے کے لیے مولانا نے نمایاں کردار ادا کیا۔ مولانا کو انگریز اُن کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے سبب

علامہ فضل حق خیرآبادی، امام بخش صہبائی اور احمد اللہ شاہ مدراسی کی صف کا مجاہد آزادی تسلیم کرتے تھے۔ بریلی میں فتوائے جہاد کی تشہیر کے بعد انگریزوں کے خلاف اقدام کرنے کے لیے جنرل بخت خاں روہیلہ کو مجاہدین کی فوج کا کمانڈران چیف بنایا گیا۔ مولانا رضا علی خاں بریلوی جہاد کمیٹی کے سرپرست تھے۔ جنرل بخت خاں روہیلہ اور خان بہادر خاں روہیلہ نبیرۂ حافظ رحمت خاں روہیلہ کبھی بھی مولانا کی ہدایت کے بغیر کوئی اقدام نہیں کرتے تھے۔

جشن یومِ آزادی اور امت مسلمہ کی بے حسی: قابل رحم وقابل توجہ

ہمیشہ کی طرح یومِ آزادی اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ آیا اور گذر گیا۔ پورے ملک میں تعلیمی اداروں اور سرکاری دفاتر میں پرچم کشائی کی گئی۔ بچوں میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں اور کئی مقامات پر ثقافتی پروگراموں کا انعقاد ہوا۔ مگر کیا ہم نے کبھی یہ سوچنے کی کوشش کی کہ اس دن کی کیا اہمیت ہے؟ تاریخ میں اس دن کا کیا مقام ہے؟ اس دن کے لیے کتنے لوگوں کو سولیوں پر چڑھایا گیا؟ کتنے مجاہدین کو انڈومان کی قیدِ تنہائی دی گئی؟ کتنے سَوتنتر تاسینانیوں کی جائیدادیں ضبط اور نیلام کی گئیں؟ کتنے بچوں کو یتیم اور کتنی سہاگنوں کو بیوہ بنایا گیا؟ افسوس تو اس بات پر ہے کہ یوم آزادی آیا اور چلا بھی گیا مگر مسلم اکثریتی علاقوں میں اس کی گونج تک نہیں سنائی دی۔ اسکولوں اور کالجوں میں روایتی طور پر پرچم لہرایا گیا، راشٹر گیت پڑھا گیا، کہیں کہیں شیرینی تقسیم کی گئی اور بس ختم۔ کیا یوم آزادی کا سورج بس اسی آدھے گھنٹے کے لیے طلوع ہوتا ہے؟ وطن کی آزادی کی خاطر جن بائیس ہزار علما اور پانچ لاکھ مسلمانوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا ان کی یاد بس دس منٹ کے لیے منانی چاہیے؟ کیا ہماری قوم اب اتنی بے حس ہوگئی ہے کہ بے لوث مجاہدین کی قربانیوں کو یونہی دبا دیا جائے؟ ممکن ہے کوئی کہے کہ ہمارے یہاں پروگراموں کا انعقاد ہوا، تقریریں ہوئیں اور مجاہدین کو خراج عقیدت بھی پیش کیا گیا۔ یہی تو ہماری کج روی اور کج فہمی ہے کہ بس چند جوشیلی تقریروں اور چھوٹے موٹے پروگراموں کو ہی ہم نے سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ کیا شہدائے آزادی کے خون کی قیمت صرف اتنی ہے کہ ان کے نام سے دو چار رَٹی رَٹائی تقریریں کرلی جائیں؟ بلکہ لُطف کی بات تو یہ ہے کہ یہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ذاتی اور

تعصب کی بنیاد پر ان ہزاروں شہیدوں کے خون کو پلید کرنے کی بھی ناکام کوشش کرتے ہیں جنہوں نے وطن کی آزادی کی آبیاری کے لیے اپنا خون پیش کیا تھا۔ اپنی تقریروں میں وہ اگر کسی مجاہدِ آزادی کا نام بھی لینے کی زحمت کرتے ہیں تو ان کی سوئی مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی جوہر اور اشفاق اللہ خاں کے اردگرد ہی تھم جاتی ہے۔ حالانکہ ان کے علاوہ سیکڑوں مسلمانوں نے وطن عزیز کے گیسوئے برہم کو اپنے خون جگر سے سنوارا ہے؟ مگر افسوس کہ آج ہماری اکثریت ان کے نام سے بھی ناواقف ہے۔ بائیس ہزار علمائے کرام کے خون سے یہ سرزمین لالہ زار بنی تب کہیں جا کر یہ ملک آزاد ہوا۔ ہمارے بچوں کے سامنے فریڈم فائٹرس کے طور پر حیدر علی، ٹیپو سلطان، علامہ فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا فیض احمد بدایونی، احمد اللہ شاہ مدراسی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا کفایت علی کافی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی، مولانا امام بخش صہبائی دہلوی، مولانا وہاج الدین مرادآبادی، مولانا رضا علی خاں بریلوی، منشی رسول بخش کاکوروی، غلام امام شہید، امیر مینائی، مفتی مظہر کریم دریابادی، منیر شکوہ آبادی، شہزادہ فیروز شاہ، نواب مجو خان، نواب شائستہ خاں، نواب سراج الدولہ اور جنرل بخت خاں وغیرہ اور بالخصوص مالیگاؤں کے شہداء عبداللہ خلیفہ خدا بخش اور محمد حسین ولد مدوسیٹھ (مدوسیٹھ کی مسجد والے)، منشی محمد شعبان، سلیمان شاہ، بدھو فریدن، محمد اسرائیل اللہ رکھا اور عبدالغفور پہلوان وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے تو وہ حیرت سے ایسا منہ تکتے ہیں جیسے کسی محیرالعقول شے کا نام لے لیا ہو، اس لیے کہ انہوں نے نصابی کتابوں، تعلیمی اداروں یا فلموں میں تو صرف جھانسی کی رانی، تاتیا ٹوپے، منگل پانڈے، بھگت سنگھ، جواہر لال نہرو اور گاندھی جی کا نام ہی سنا، پڑھا اور دیکھا ہے۔

یہ لکھتے ہوئے راقم کو ذرّہ برابر بھی خوف نہیں کہ علمائے اسلام اور مجاہدین آزادی کے ساتھ تاریخ نویسوں نے جتنا ظلم کیا ہے اتنا ہی ہم نے بھی کیا ہے۔ باطل تو کسی طرح ہمارے نام و نشان کو مٹانے کے درپے ہے ہی، اس پر ہماری بے حسی سونے پر سہاگہ۔ ہماری تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جا رہا ہے، نصابی کتابوں سے مسلم شخصیات اور مجاہدین کے باب کو خارج کیا جا رہا ہے اس پر اُفتاد یہ کہ ہمیں اپنے ہی سرفروشوں کی قربانیوں کی یاد تازہ کرنے کی

فرصت نہیں۔ ہمارا شہر مسجدوں اور میناروں کا شہر کہلاتا ہے، مجھے بتاؤ ہمارے شہر کے کتنے مدرسوں میں جشن یوم آزادی منایا گیا؟ کتنے مدرسوں میں مدرسین اور اہل علم نے مسجد و محراب سے اسلاف کی درد بھری قربانیوں کو بیان کیا؟ ہمارا حال تو یہ ہے کہ مسجد کے امام صاحب اور مدرسے کے مدرس صاحب سے اگر کوئی پوچھ لے کہ پچاس مسلم مجاہدین آزادی کے نام بتاؤ تو شاید ہی کوئی بتا پائے۔ (الا ماشاء اللہ) جن مقامات سے آزادی کی لہر نے جنم لیا تھا، مساجد کے ائمہ اور مدارس کے فارغین نے اپنی ہتھیلیوں پر اپنے سروں کا نذرانہ لے کر ۱۸۵۷ء میں انقلاب کی چنگاری جلائی تھی، آج انہیں مقدس مقامات کے علمبردار اپنی تاریخ سے نا آشنا اور نابلد ہیں۔ جب اہل علم طبقہ ہی اپنی تاریخ سے نا آشنائی کا شکار ہے تو پوری امت کا اللہ ہی نگہبان۔ جب کہ یہ ایک مسلم الثبوت اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہندوستان کی آزادی علمائے کرام ہی کے دم قدم سے متصور ہے۔ آج ہم آزادی کی جس خوش گوار فضا میں زندگی کے لمحات بسر کر رہے ہیں، یہ علمائے حق ہی کے سرفروشانہ جذبات اور مجاہدانہ کردار کا ثمرہ ہے۔ انھیں کے مقدس لہو سے شجر آزادی کی آبیاری ہوئی ہے۔ آزادی کی اساس اور بنیاد ہی ہم ہیں۔ اس ملک کی آزادی کے لیے غیروں نے جتنا پسینہ نہیں بہایا اس سے کہیں زیادہ ہمارے اسلاف نے خون بہایا ہے۔

شہر مالیگاؤں کو بھی اس سبب سے خاص اہمیت حاصل ہے کہ یہاں کے جیالوں نے مالیگاؤں میں موجود زمینی قلعہ پر ترنگا پرچم لہرا کر آزاد ہندوستان کا پیغام دیا تھا مگر افسوس! برطانوی پنجہ حریت کے ان متوالوں کی گردنوں تک پہنچ گیا اور انھیں پھانسی کے پھندوں پر لٹکا دیا گیا۔ آج بھی مالیگاؤں میں تعمیر ”شہیدوں کی یادگار“ اہل سیاست کو پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ مجھ پر ان سرفروشوں کے نام کب کندہ کروائے جائیں گے جو آزادی کے لیے پونہ کی یروڈہ جیل میں تختۂ دار پر چڑھ گئے؟ اگر یہ جان دینے والے غیر ہوتے تو کیا اب بھی ان کی سمادھی بغیر نام کے کھڑی رہتی؟؟ پونہ قبرستان میں دفن شہیدوں کے جسم الیکشن میں کیے گئے وعدوں کی تکمیل کا اب بھی بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔ اب کہاں گئے وہ تمام سیاست داں جنھوں نے الیکشن پریڈ میں شہیدوں کی یادگار پر شہیدوں کے نام کندہ کروانے کا عہد کیا

تھا؟ الیکشن پریڈ میں اہل سیاست ہر چوک، ہر چوراہے، ہر کلب غرضیکہ جہاں جہاں ممکن ہو ہر جگہ پارٹی کا پرچم نصب کیا جاتا ہے مگر افسوس! یوم آزادی پر ترنگے کو فراموش کر دیا گیا۔ کیا حُبّ الوطنی اسی کا نام ہے؟ جب کہ ہمارا مذہب تو ہمیں اپنے ملک سے محبت کا پیغام دیتا ہے۔ خدارا خدارا! اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اپنی تاریخ کو نئی نسلوں تک پہنچانے کی کوشش کرو، ورنہ جو قوم اپنی تاریخ کو بھلا دیتی ہے، وہ قوم صفحۂ دہر سے مٹادی جاتی ہے ؎

کیا اسی لیے تقدیر نے چُنوائے تھے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

ماحصل

علامہ یاسین اختر مصباحی صاحب لکھتے ہیں: ''آزادی کی پوری تاریخ علمائے اہلسنّت کی قربانیوں سے بھری پڑی ہے۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ آزادیٔ ہند کی صحیح تاریخ دنیا کے سامنے پیش کریں اور بتلائیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت اہلسنّت و جماعت نے کی ہے اور اس دیش کی آزادی کے لیے خون کے قطرات ہمارے اسلاف نے بہائے ہیں۔ میدان جنگ میں تیر وسنان کے مقابلے کی جب بھی ضرورت پیش آئی ہے تو ہم نے اپنا سینہ پیش کیا ہے۔ اگر کوئی نام نہاد مؤرخ اہلسنّت و جماعت کی خدمات اور قربانیوں کو نظر انداز کرتا ہے، تاریخ گڑھتا ہے، تاریخ کا چہرہ مسخ کرتا ہے تو یہ اس کی بدبختی ہے اور وہ تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں کر رہا ہے بلکہ تاریخ کے ساتھ ظلم کر رہا ہے۔

علامہ یاسین اختر مصباحی صاحب رقمطراز ہیں: ''تقریباً دو سو سال کی تاریخ ایسی لکھی گئی ہے کہ علمائے اہلسنّت کے کردار کو فراموش کرنے یا داغ دار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب ہمارا آپ کا فرض ہے کہ اس تاریخ کو درست کریں۔ سب سے پہلے تاریخ کو سمجھیں، سمجھائیں، پوچھیں، تحقیق کریں اور اس کے بعد اس تاریخ کو صحیح و درست کر کے دنیا کے سامنے پیش کریں کہ ہم یہ ہیں اور ہمارا یہ کام ہے۔'' (علمائے اہلسنّت کی بصیرت و قیادت، ص ۱۱۳)

اک اک نفس میں بوئے وطن ہے بسی ہوئی

نبضِ وطن میں خون کی صورت رواں ہیں ہم

اس ضمن میں مولانا محمد عبدالشاہد خاں شروانی کی ''باغی ہندوستان''، علامہ یاسین اختر مصباحی کی چار کتابیں (۱) علامہ فضل حق خیرآبادی اور انقلاب ۱۸۵۷ء (۲) چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء (۳) ۱۸۵۷ء پس منظر و پیش منظر (۴) علمائے اہلسنّت کی بصیرت و قیادت، مولانا خوشتر نورانی صاحب کی کتاب ''علامہ فضل حق خیرآبادی چند عنوانات'' اور مولانا عبدالمالک مصباحی صاحب کی کتاب ''خطبات اسلام''، پروفیسر ارتضیٰ کریم کی ترتیب کردہ ''۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی''، پروفیسر محمد ایوب قادری کی کتاب ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد: مولانا فیض احمد بدایونی''، پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد کی کتاب ''علامہ فضل حق خیرآبادی'' اور فورٹ ولیم کالج کے رائٹر میر امن دہلوی کی ''باغ و بہار'' سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں موجود تمام مواد انہی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

استفادۂ خصوصی:

(۱) تذکرۃ الانبیاء، از: علامہ عبدالرزاق بھترالوی صاحب، رضوی کتاب گھر، ۲۰۰۲ء

(۲) ماہنامہ کنزالایمان، مارچ ۲۰۱۰ء، از: مولانا محمد رفیق احمد مصباحی، ص ۳۵

(۳) سلطان الہند خواجہ غریب نواز علیہ الرحمہ، از: ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی صاحب، فاروقیہ بکڈپو، مئی ۱۹۹۷ء

(۴) باغی ہندوستان، از: مولانا محمد عبدالشاہد خاں شیروانی، المجمع الاسلامی مبارک پور، ۲۰۱۱ء

(۵) ۱۸۵۷ء پس منظر و پیش منظر، از: علامہ یاسین اختر مصباحی صاحب، دارالقلم دہلی ۲۰۰۷ء

(۶) چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء، از: علامہ یاسین اختر مصباحی صاحب،، دارالقلم دہلی ۲۰۰۷ء

(۷) علامہ فضل حق اور انقلاب ۱۸۵۷ء، از: علامہ یاسین اختر مصباحی صاحب، دارالقلم دہلی ۲۰۰۷ء

(۸) علمائے اہلسنّت کی بصیرت وقیادت، از: علامہ یاسین اختر مصباحی صاحب، دارالقلم دہلی، ۲۰۱۲ء

(۹) علامہ فضل حق خیرآبادی چند عنوانات، از: مولانا خوشتر نورانی صاحب، قومی کونسل برائے فروغ اردو دہلی، ۲۰۱۳ء

(۱۰) خطبات اسلام، از: مولانا عبدالمالک مصباحی، ماہ نور پبلیکیشنز دہلی، فروری ۲۰۰۷ء

(۱۱) ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی، ترتیب: پروفیسر ارتضیٰ کریم، موڈرن پبلشنگ ھاؤس، ۲۰۱۰ء

(۱۲) جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد: مولانا فیض احمد بدایونی، از: پروفیسر محمد ایوب قادری، تاج الفحول اکیڈمی بدایوں، ۲۰۰۷ء

(۱۳) باغ و بہار، از: میر امن دہلوی، اعجاز پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۳ء

(۱۴) وکی پیڈیا

(۱۵) یادگار غالب، از: الطاف حسین حالی، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، ۲۰۱۲ء

(۱۶) محمد حسین آزاد، از: نند کشور وکرم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۲ء

(۱۷) گل رعنا، از: مولانا حکیم سید عبدالحیٔ صاحب، مطبع معارف اعظم لکھنؤ، ۱۳۴۰ھ

(۱۸) آب حیات، از: محمد حسین آزاد، اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۳ء

(۱۹) علامہ فضل حق خیرآبادی، رضا اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۲ء

☆☆☆

مکتبۂ طیبہ سے

عطاء الرحمٰن نوری کی مطبوعات

(۱) حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ
(۲) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ
(۳) حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کی چند ناصحانہ باتیں
(۴) جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں علما کا مجاہدانہ کردار

غیر مطبوعہ کتابیں:

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لاڈلی بیٹی: خاتون جنت
(۲) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عدالتی فیصلے
(۳) زبان کا استعمال کیسے کریں؟
(۴) شہر مالیگاؤں تیرے حال پہ رونا آیا
(۵) اردو اصناف سخن
(۶) فروغ اردو میں صوفیا کا کردار
(۷) نواب مرزا داغ دہلوی: دبستان دہلی کا آخری نمائندہ
(۸) ترقی پسند تحریک: اُردو ادب کی عظیم تحریک
(۹) تذکرہ نویسی: تعریف، اہمیت اور اجمالی تاریخ
(۱۰) ملا وجہی: گولکنڈہ کا ''دکن نور'' ہیرا
(۱۱) مسابقاتی امتحانات کی تیاری کے رہنما اصول